بسم الله الرحمن الرحيم

مقالہ نگاروں کے لیے ہدایات

ا۔ "دریافت" ایچ۔ای۔ سی(HEC) سے منظور شدہ "Y" کٹیگری کا حامل تحقیقی و تنقیدی مجلّہ ہے جس میں اردو زبان و ادب کے حوالے سے غیر مطبوعہ مقالات ایچ۔ای۔ سی(HEC) کے طے کردہ اصول وضوابط کے مطابق شائع کیے جاتے ہیں۔

۲۔ تمام مقالات کا اشاعت سے قبل اندرون ملک اور بیرون ملک ماہرین سے "Double Blind Peer Review" ہوتا ہے جس میں دو سے تین ماہ لگ سکتے ہیں۔

۳۔ دریافت کی اشاعت سال میں دو دفعہ بالترتیب جون اور دسمبر میں ہوتی ہے۔

۴۔ "دریافت" کا اختصاص اردو زبان وادب کے درج ذیل زمروں میں معیاری مقالات کی اشاعت ہے:

ا۔ تحقیق: متنی / موضوعی۔ ب۔ مباحث: علمی / تنقیدی۔

ج۔ مطالعہ ادب: اردو فکشن / شاعری۔ د۔ تنقید و تجزیہ: اردو فکشن / شاعری، اقبال شناسی وغیرہ

۵۔ تراجم اور تخلیقی تحریریں مثلاً غزل، نظم، افسانہ وغیرہ قطعاً ارسال نہ کی جائیں۔

۶۔ "دریافت" میں مقالہ بھیجنے کے بعد اس کے انتخاب یا معذرت کی اطلاع موصول ہونے تک مقالہ کہیں اور نہ بھیجا جائے۔

۷۔ "دریافت" کی ایچ۔ای۔ سی(HEC) میں طے شدہ درجہ بندی 'اردو' ہے۔ دیگر شعبہ جات کے اسکالرز مقالات نہ بھیجیں۔

۸۔ مقالہ اُردو زبان میں ہونا چاہیے۔ کسی دوسری زبان میں لکھا جانے والا مقالہ ناقابلِ قبول ہو گا۔

۹۔ مقالہ بھیجتے وقت درج ذیل امور کا خیال رکھا جائے:

i۔ مقالہ صرف OJS (https://daryaft.numl.edu.pk/index.php/daryaft) پر ارسال کیا جائے۔

ii۔ نمل ریسرچ پالیسی کے مطابق مقالے کی فیس -/13,000 روپے مقرر کی گئی ہے تفصیل کے لیے ویب گاہ ملاحظہ کیجیے۔

iii۔ مقالے کا عنوان، محقق کا نام اور عہدے کے متعلق تمام تفاصیل اُردو اور انگریزی کے درست ہجوں کے ساتھ درج کی جائیں۔

iv۔ مقالے کا ملخص (Abstract) اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں تقریباً ۱۵۰-۲۰۰ الفاظ پر مشتمل ہو۔ نیز مقالے کے کلیدی الفاظ Keywords بھی انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں لکھے جائیں۔

v۔ مقالے کی موصولی، مقالے کا قابلِ اشاعت ہونے یا نہ ہونے کی اطلاع صرف برقی پتا (E.Mail) کے ذریعے دی جائے گی۔ اس لیے مقالہ نگار اپنا مستند برقی پتا، اپنا مکمل پتا اور رابطہ نمبر بھی درج کریں۔

vi۔ مقالے کے ساتھ الگ صفحے پر حلف نامہ منسلک کیا جائے کہ یہ تحریر غیر مطبوعہ ہے، مسروقہ یا کاپی شدہ نہیں ہے۔

vii۔ کمپوزنگ Microsoft Word میں ہو۔ (فائل: A4، مارجن چاروں جانب ایک انچ)۔ متن کا فونٹ سائز ۱۳ رکھا جائے۔ مقالے میں ہندسوں کا اندراج اردو میں ہو۔ مقالے کے لیے صفحات کی تعداد کم از کم ۱۰ سے ۱۵ ہے۔

viii۔ مقالے کے آخر میں حوالہ جات اردو کے ساتھ ساتھ **Roman Script** میں بھی ضرور درج کیے جائیں۔ بصورت دیگر مقالہ قابل قبول نہیں ہو گا۔

ix۔ حوالہ جات میں ایم ایل اے (MLA) فارمیٹ کی پیروی کی جائے۔

x۔ مقالے میں کہیں بھی آرائشی خط، علامات یا اشارات استعمال نہ کیے جائیں۔

xi۔ مجوزہ شرائط پوری نہ ہونے کی صورت میں مقالہ رد کر دیا جائے گا۔

دریافت

جلد :16 شمارہ :02

ISSN Online: 2616-6038

ISSN Print: 1814-2885

سرپرستِ اعلیٰ

میجر جنرل(ر) شاہد محمود کیانی، ہلال امتیاز (ملٹری)، ریکٹر

مدیر اعلیٰ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی، ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

مدیر

ڈاکٹر ظفر احمد

معاون مدیر

ڈاکٹر ابو بکر صدیق راٹھور

تحقیقی معاون

محمد عرفان

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

E-mail:daryaft@numl.edu.pk

Web(OJS): https://daryaft.numl.edu.pk/index.php/daryaft

مجلسِ ادارت (بین الاقوامی)

پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوقار

صدرِ شعبہ اردو زبان وادب چیئر، استنبول یونیورسٹی، استنبول، ترکیہ

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین

شعبہ اردو، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی، انڈیا

پروفیسر ڈاکٹر آسمان بیلن اوزجان

صدرِ شعبہ اردو، انقرہ یونیورسٹی، انقرہ، ترکیہ

پروفیسر ڈاکٹر محمود الاسلام

شعبہ اردو، فیکلٹی آف آرٹس، ڈھاکہ یونیورسٹی، ڈھاکہ، بنگلہ دیش

پروفیسر ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم

صدرِ شعبہ اردو، فیکلٹی آف ہیومینٹیز، الازہر یونیورسٹی (گرلز کیمپس)، قاہرہ، مصر

مجلسِ ادارت (ملکی)

پروفیسر ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر

ڈین، فیکلٹی آف سوشل سائنسز اینڈ ہیومینٹیز، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران

ڈائریکٹر، انسٹیٹیوٹ آف اردو لینگویج اینڈ لیٹریچر، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر تنظیم الفردوس

صدرِ شعبہ اردو، کراچی یونیورسٹی، کراچی، پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر روبینہ ترین

شعبہ اردو، بہاوالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، پاکستان

مجلسِ مشاورت (بین الاقوامی)

پروفیسر ڈاکٹر ہنس ورنر ویسلر

شعبہ لسانیات اور فلالوجی، اپسالا یونیورسٹی، اپسالا، سویڈن

پروفیسر ڈاکٹر شہاب الدین

شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، انڈیا

پروفیسر ڈاکٹر معین الدین جینابڑے

سنٹر فار انڈین لینگویجز، سکول آف لینگویج لٹریچر اینڈ کلچرل سٹڈیز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نیو دہلی ، انڈیا

پروفیسر ڈاکٹر محمد محفوظ احمد

صدرِ شعبہ اردو، فیکلٹی آف ہیومینٹیز اینڈ لینگویجز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نیو دہلی، انڈیا

ڈاکٹر آرزو چفت سورین

شعبہ اردو، یونیورسٹی آف استنبول، استنبول، ترکیہ

مجلسِ مشاورت (ملکی)

پروفیسر ڈاکٹر خالد محمود خٹک

چیئرمین، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف بلوچستان، کوئٹہ، پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر ضیا الحسن

انسٹیٹیوٹ آف اردو لینگویج اینڈ لیٹریچر، اورینٹل کالج، یونیورسٹی آف پنجاب، لاہور، پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شاہین

صدرِ شعبہ اردو، پشاور یونیورسٹی، پشاور، پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر صائمہ ارم

چیئرپرسن، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور، پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر سہیل عباس

چیئرپرسن ، شعبہ اردو، غازی یونیورسٹی، ڈیرہ غازی خان، پاکستان

جملہ حقوق محفوظ

دریافت جلد:16 شمارہ:02 (جولائی تا دسمبر 2024ء)
ناشر: نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد۔ مطبع: نمل پرنٹنگ پریس، اسلام آباد
رابطہ: شعبہ اردو زبان و ادب، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، ایچ/نائن، اسلام آباد
فون:10-051-9265100/Ext:2262 ای میل: daryaft@numl.edu.pk
ویب سائٹ(OJS):https://daryaft.numl.edu.pk/index.php/daryaft
قیمت فی شمارہ:2000 روپے(انفرادی) 3000روپے(ادارہ جاتی)
بیرون ملک:20 ڈالر(انفرادی) 30ڈالر(ادارہ جاتی) (علاوہ ڈاک خرچ)

فہرست

اداریہ

مکاتیبِ علامہ محمد اقبال بنام غلام عباس آرام: متن، حواشی اور اہم مباحث کا جائزہ	ڈاکٹر طارق محمود / ڈاکٹر علی بیات	۱
تاریخی ڈراموں کے تناظر میں بر صغیر پاک وہند کی ثقافت پر ترک ڈرامے "کرولوش عثمان" کے اثرات کا مطالعہ	ڈاکٹر محسن رمضان اشسیور / زینب التن کوپریو	۲۳
معاصر بلوچستانی اردو نظم کا اساطیری اور داستانوی رنگ	ڈاکٹر قندیل بدر	۳۲
عاصم بٹ کے ناول "دائرہ" میں شناخت کا مسئلہ	سعیدہ ارم / ڈاکٹر ناہید قمر	۵۱
منتخب اردو فونٹس کا تکنیکی تقابل	ظہور احمد / ڈاکٹر رئیس احمد مغل	۶۴
لارنس وینوتی کے نظریات ترجمہ کے تحت منٹو کے افسانہ "ممی" کے انگریزی تراجم کا مطالعہ	عطرت بتول / ڈاکٹر اقلیمہ ناز	۷۹
جدید اُردو فکشن: خواندگی کی سیاست اور سوال کی موت	ڈاکٹر محمد سہیل اقبال / ڈاکٹر محمد راشد اقبال	۹۸
"انواسی": اثبات مرگ کا اظہاریہ	ڈاکٹر عابدہ نسیم	۱۰۹
انڈیکس		۱۱۷

اداریہ

معاصر سماج نے حیات انسانی کی ہر سطح پر نئی تشریح اور نئی تعبیر کرتے ہوئے بہت سے پیچیدہ سوالات اور معاملات کو از سر نو زندہ کیا ہے۔ ایسے میں ادب کے تخلیق کاروں نے معاصر سماجی فکر کی ترجمانی کرتے ہوئے سوالات کو ابھارنے اور معاملات کی نشاندہی کرنے میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ ادیبوں نے اپنی تخلیقات میں اس تیز رفتار زندگی اور ہر بدلتے دن کے ساتھ بدلتے سیاسی، سماجی، معاشی اور جغرافیائی منظر نامے پر آنے والی تبدیلیوں کو اپنے بیانیے کا حصہ بنایا۔

تخلیق کاروں کی طرح محققین نے بھی اپنی ذمہ داری نبھاتے ہوئے تخلیق کے نئے نظریات کی دریافت کے ساتھ ساتھ ان کے اطلاق اور تشریح و توضیح میں کمی نہیں کی۔ ادبی تخلیقات کی نئی جہتوں کی نشاندہی کرتے ہوئے سماج کے فکری رجحانات، مسائل اور ان کی تفہیم و تشریح کے لیے نئی راہیں متعین کیں۔

عالمی سطح پر ہونے والی تبدیلیاں "گلوبل ورلڈ" کے نظریے کو تقویت دیتے ہوئے عالمی زبانوں کے ادب کی اہمیت اور ان کے تراجم کو لازم بنا رہی ہیں۔ عالمی ادب میں ہونے والے تراجم نے کس طور ہمارے سماج کو متاثر کیا ہے اس پر غور و فکر کرنے کی ضرورت نے محققین کی توجہ حاصل کی۔

ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی دریافت میں بین الثقافتی اور عالمی ادبیات کے مطالعات کے پیش نظر اس جانب توجہ دلائی گئی ہے۔ اس مرتبہ کے شمارے میں ایسے مقالات شامل کیے گئے ہیں جو اردو زبان و ادب کے تحقیقی ذخائر میں بیش قدر اضافہ ثابت ہوں گے۔

مدیران

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلہ
دریافت

Received: 15th Aug, 2024 | Accepted: 10th Dec, 2024 | Available Online: 31st Dec, 2024
Digital Object Identifier: 10.52015/daryaft.v16i02.400

مکاتیبِ علامہ محمد اقبال بنام غلام عباس آرام: متن، حواشی اور اہم مباحث کا جائزہ

Letters of Allama Muhammad Iqbal to Ghulam Abbas Aram: Review of Text, Footnotes and Key Discussions

DR. TARIQ MAHMOOD[1] **AND DR. ALI BAYAT**[2]

[1] Associate Professor, Department of Urdu, GC University, Faisalabad, Pakistan
[2] Associate Professor, Department of Urdu Language and Literature, University of Tehran, Iran
Corresponding Author: Dr.Tariq Mahmood (drtariqhashmi@gcuf.edu.pk)

Abstract: One of Iqbal's correspondents was Ghulam Abbas Aram who was serving in Bombay at that time. He was born in 1903 in Yazd. His father, Ali-Reza, a tea seller, was a preacher of the Baha'i sect. It is clear from Ghulam Abbas Aram's Makatib-e-Iqbal that he was a scholar who had a special interest in poetry, literature, Sufism and philosophy. The available letters of Allama Iqbal to Ghulam Abbas Aram are in English, four in number and their duration is very limited. No information is available about how the introduction between Iqbal and Aram came about. Ghulam Abbas Aram neither wrote any article nor any other writing about Allama Iqbal's thoughts and correspondence with him. In this way, there is no other sign except these letters in his remaining documents. However, Ghulam Abbas Aram made sure that he kept them safe in his personal documents. Later, a distinguished Iranian translator and researcher, Dr. Hussain Ali Nozri, translated these English letters into Persian and they appeared in the first issue of the former magazine of this institute, "*Tarikh Maasari Iran*" in 1997.

These letters are very helpful in understanding Iqbal's intellectual connection and preoccupation with Iran.

Keywords: Ghulam Abbas Aram, Iqbal, Letters, Iran, Zoroastrianism, Tagore

اقبال کے فکری نظام کی تفہیم کے لیے جہاں ان کی شعری اور نثری تصانیف معاون ہیں، وہاں ان کے مکاتیب کو بھی اہم دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔ اقبال کی مکتوب الیہ شخصیات متنوع جہتوں کی حامل ہیں جن میں تخلیق کار، صاحبانِ علم، اربابِ سیاست اور اہلِ مذہب و تصوف شامل ہیں۔ آپ کے مکاتیب کی اشاعتیں مختلف اداروں سے منظرِ عام پر آچکی ہیں اور مرتبین نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ آپ کے خطوط کے ایک جامع مجموعے کی تالیف ہو سکے۔ مرتبین اپنی کاوشوں میں بہت حد تک کامیاب ہوئے ہیں لیکن تحقیق کا دروازہ تاحال کھلا ہے اور نہ صرف اقبال کے خطوط بلکہ بعض دیگر نایاب تحریروں کو منظر عام پر لانے کے لیے اہلِ تحقیق کوشاں ہیں۔
اقبال کی مکتوب الیہ شخصیات میں تاحال ایک ایرانی کا سراغ ملا تھا۔ خط کتابت کے سلسلے میں یہ بات ضرور مشہور ہے کہ انھوں نے سعید

This work is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

نفیسی کو فارسی زبان میں دو خط ۲۶ اگست ۱۹۳۲ء اور ۴ نومبر ۱۹۳۲ کو لکھے ہیں لیکن یہ حقیقت اب تک مخفی رہی کہ اقبال کے ایک مکتوب الیہ غلام عباس آرام بھی تھے جو اس وقت بمبئی میں اپنی خدمات انجام دے رہے تھے۔ اقبال اور آرام کے مابین تعارف کیسے ہوا، اس کے بارے میں کوئی معلومات دستیاب نہیں ہو سکیں۔

غلام عباس آرام کی پیدائش ۱۹۰۳ء میں یزد میں ہوئی۔ ان کے والد علی رضا چائے فروش، بہائی فرقے کے مبلّغ تھے۔ غلام عباس نے ابتدائی تعلیم یزد میں حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیے انگریزی مِشنریوں کے ایک اسکول میں داخل ہوئے اور تعلیم کی غرض سے اصفہان میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے، ہندوستان کا سفر کیا۔ بمبئی میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد، کلکتہ گئے اور وہاں کے ایک ایرانی الاصل اصفہانی تاجر کی دکان میں سیکریٹری مقرر ہوئے۔ اس دوران وہ ہندوستان سے شائع ہونے والے دو ایرانی (فارسی) اخبار یعنی "حبل المتین" اور "موئید الاسلام" کے ساتھ منسلک رہے۔ ایک کالج "لامارتی" میں تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد کلکتہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔

۱۹۲۳ء میں کلکتے میں موجود ایرانی قونصلیٹ کے قونصلر معززالدولہ کے حکم سے اس دفتر میں سیکریٹری کے طور پر فرائض انجام دینے کا موقع ملا۔ اس کے بعد جب یہ قونصلیت دہلی منتقل ہوا، تو عباس آرام بھی، بطور مترجم دہلی آ گئے۔ ۱۹۳۵ء میں ۱۲ سال ہندوستان اور دیگر ممالک میں قیام کے بعد، وزارت خارجہ کے حکم سے تہران لوٹ آئے اور ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے، امور خارجہ کے وزیر اور کئی ممالک میں سفیر کے طور پر اپنی خدمات سر انجام دیں۔ سیاست میں داخل ہونے کے بعد، تمام عمر پہلوی خاندان کی خدمت میں صرف کر دی اور بالآخر ۱۹۸۴ء میں عالمِ تنہائی میں ان کا انتقال ہوا۔ غلام عباس آرام کے نام علامہ اقبال کے دستیاب خطوط انگریزی میں رقم کیے گئے ہیں جو تعداد کے اعتبار سے چار ہیں اور ان کا دورانیہ نہایت محدود ہے۔ ان مکاتیب کی تفصیل یوں ہے:

پہلا خط: ۲۰ جون ۱۹۳۲ء

دوسرا خط: ۲۷ جون ۱۹۳۲ء

تیسرا خط: ۶ جولائی ۱۹۳۲ء

چوتھا خط: ۱۳ جولائی ۱۹۳۲ء

علامہ اقبال کے خیالات اور آپ سے خط کتابت کے بارے میں غلام عباس آرام نے نہ تو کوئی مضمون لکھا اور نہ کوئی اور تحریر۔ اس طرح ان کی باقی ماندہ دستاویزات میں بھی ان خطوط کے سوا کوئی دوسرا نشان نہیں ملتا ہے۔ البتہ غلام عباس آرام نے یہ ضرور کیا کہ اپنی ذاتی دستاویزات میں ان کو محفوظ رکھا۔ غلام عباس آرام کی مذکورہ ذاتی دستاویزات، ایران کے ایک ادارہ "مطالعات تاریخ معاصر" میں موجود ہیں۔ بعد ازاں ایک فاضل ایرانی مترجم اور محقق ڈاکٹر حسین علی نوذری نے ان انگریزی خطوط کا فارسی ترجمہ کیا اور یہ ۱۹۹۷ء میں ادارہ "مطالعات تاریخ معاصر" کے سابق مجلہ "تاریخ معاصر ایران" کے پہلے شمارے میں منظرِ عام پر آئے۔ مذکورہ مکاتیب میں شامل تاریخی اور علمی مباحث سے قبل ذیل میں ان خطوط کا متن ملاحظہ ہو:

مکاتیبِ علامہ محمد اقبال بنام غلام عباس آرام کا متن

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024
تحقیقی وتنقیدی مجلہ
دریافت

پہلا خط

۲۰ جون ۱۹۳۲ء

ڈاکٹر سر محمد اقبال

ایم اے، پی ایچ ڈی، بار ایٹ لا، لاہور

میرے پیارے جنابِ آرام!

میں نے اپنے سیکریٹری سے کہا ہے کہ وہ میری چند کتب آپ کی خدمت میں ارسال کر دے اور مجھے امید ہے کہ آپ انھیں میری طرف سے بطور تحفہ قبول کریں گے۔

" Six Lectures "[1] ایک بہت ہی تکنیکی کتاب ہے اور (اپنی تفہیم کے لیے) تقاضا کرتی ہے کہ جدید سائنس اور فلسفہ کے کچھ جدید ترین تصورات سے عمدہ آگاہی ہو لیکن چونکہ آپ تصوف اور مذہبی فلسفے میں دلچسپی رکھتے ہیں تو مجھے امید ہے کہ آپ کو زیادہ اکتاہٹ نہیں ہو گی۔ دیگر کتب جو میں آپ کو بھیج رہا ہوں، خطبات کے مقاصد کی تفہیم میں کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں۔

تصوف کے بارے میں اگر آپ عربی میں ابو طالب مکی[2] کی کتاب "قوت القلوب" کو پڑھ چکے ہیں تو، یہ تصوف کے بارے میں سب سے قدیم اور سبق آموز کام ہے۔ اس کے بعد کی تصنیف "کشف المحجوب"[3] سید علی ہجویری کی ہے، جو لاہور کے ایک عظیم صوفی اور اصلاً غزنی کے ہیں۔ اس کتاب کا انگریزی میں مختصر ترجمہ کیمبرج سے ڈاکٹر نکلسن نے شائع کیا تھا[4]۔ میرے خیال میں یہ کتاب لوزاک[Luzac][5] سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ عراقی[6] کی "لمعات" کو محی الدین العربی [7] کی "فتوحاتِ مکیہ" کے مطالعے کے بغیر مکمل طور پر سمجھا نہیں جا سکتا۔ شاعری میں محمود شبستری[8] کی کتاب "گلشنِ راز" موجود ہے۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی دستیاب ہے۔ زبورِ عجم میں جو میں آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں، آپ کو "گلشن راز جدید" کے نام سے ایک نظم مل جائے گی جو محمود کی نظم کے جواب میں لکھی گئی تھی اور سب سے بڑھ کر رومی کی مثنوی ہے، جسے میں ذاتی طور پر کسی بھی دوسری کتاب پر ترجیح دیتا ہوں۔ ڈاکٹر نکلسن نے پوری کتاب کا مکمل انگریزی ترجمہ اپنے اصل فارسی متن کے ساتھ شائع کیا، جس کی انہوں نے مصر میں دریافت ہونے والے مخطوطے سے تقابل کرنے کے بعد احتیاط اور بہت توجہ سے تدوین کی تھی۔ یہ مخطوطہ رومی کی وفات کے ۵۰ سال بعد لکھا گیا تھا اور یہ شاید باقی بچ جانے والا قدیم ترین نسخہ ہے۔ دریاباد، ضلع بارہ بنکی (متحدہ صوبے، ہندوستان) سے گریجوئیٹ جناب عبد الماجد[9] نے رومی کی کتاب "فیہ مافیہ"[10] کی تدوین کر کے شائع کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ انھیں لکھیں تو وہ آپ کو ایک کاپی بھیجیں گے۔ ہندوستان میں اب بھی مثنوی رومی کے بہت سارے قارئین ہیں اور یہ ہندوستان میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں میں سے ایک ہے۔

دیوانِ شمس تبریز کے عنوان سے رومی کی بعض تخلیقات کا بھی نکلسن نے انگریزی میں ترجمہ [11] کیا ہے۔ مذکورہ بالا تقریباً تمام کتابیں لوزاک ارسال کر دے گا۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلہ
دریافت

دوسرا خط

۲۷جون ۱۹۳۲ء

ڈاکٹر سر محمد اقبال

ایم اے، پی ایچ ڈی، بار ایٹ لا، لاہور

محترم جنابِ آرام

آپ کے خط کا بہت شکریہ جو مجھے چند لمحے قبل موصول ہوا۔ ہاں، میں نے حافظ کے بارے میں میر ولی اللہ کی کتاب (1) کے کچھ حصے پڑھے ہیں۔ وہ فارسی زبان کے ایک اچھے محقق ہیں اور بہ طور شارح عمدہ کام کیا ہے، لیکن میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں شاعری کی شرح پر زیادہ یقین نہیں رکھتا ہوں۔ کئی برس پہلے کسی نے حافظ کے دیوان کا پنجابی میں ترجمہ (2) کیا تھا۔ مجھے یہ ترجمہ ہندوستان میں رقم کی گئی کلامِ حافظ کی کسی بھی شرح سے زیادہ پسند آیا۔ تاہم، ولی اللہ کی تشریح مجموعی طور پر اچھی ہے۔ جہاں تک " Voice from the East" (3) اور میری نگارشات پر دیگر کتابوں کا تعلق ہے، میں کوشش کروں گا کہ اگر ان کتابوں کے نسخے یہاں دستیاب ہوں تو آپ کو بھیج دوں۔ طویل عرصہ پہلے ایک اردو کتاب (4) لکھی گئی تھی ، اور جہاں تک مجھے یاد ہے ، یہ محض میری اردو تخلیقات کے تجزیے پر مشتمل ہے۔ ایک مقامی ماہنامہ (5) کا "خصوصی شمارہ اقبال" اکتوبر میں منظرِ عام پر آئے گا۔ یہ ۴۰۰ صفحات کو محیط، صرف میری نگارشات کے لیے مخصوص ہو گا۔ اس کی اشاعت کے بعد ایک کاپی آپ کو ارسال کی جائے گی۔

میں نے " زمیندار " کا نوٹ دیکھا ہے اور میں آپ سے متفق ہوں۔ کسی فریق پر بھی الزام نہیں عائد کیا جانا چاہیے۔ ہندوستانی مسلمان ۱۸۵۷ء سے عملی طور پر جیل میں ہیں۔ حالات اب تیزی سے بدل رہے ہیں۔ تجارتی راستوں سے اب وسطی اور مغربی ایشیا کو بے حد معاشرتی، معاشی، سیاسی اور ثقافتی فوائد حاصل ہوں گے۔ لیکن اس وقت جو پروپیگنڈا چل رہا ہے، بالخصوص ہندوستانی پریس میں، وہ ایران کے خلاف ہے۔ اس پروپیگنڈے کو ٹیگور کے ایران کے دورے (6) کا مقصد ہندوؤں اور ایرانیوں کے مابین آریائی تعلقات کو بڑھانا اور مستحکم کرنا تھا (یہ حقیقت میں ہندوستانی پریس کی ٹیگور کے دورہ ایران کی تشریح ہے)، اس پروپیگنڈے کے ساتھ نتھی کیا گیا کہ ایران زرتشتی مذہب قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔ نام نہاد ایرانی قوم پرستوں کی تحریروں میں اسلام مخالف اشارے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ سب مل کر کام کرتے ہیں اور ایران کو بے حساب سیاسی نقصان پہنچاتے ہیں اور ممکن ہے کہ مستقبل میں اس کے برے نتائج سامنے آئیں۔ ایشیا کا مستقبل وسطی ایشیا اور مغربی ایشیا کے ممالک کے اتحاد پر منحصر ہے، چاہے وہ مسلمان ہیں یا نہیں۔ اسلام کا عروج ہی ایشیا اور یورپ کے درمیان ایک حصار تھا۔ ناوارون کی جنگ (7) میں ترک بحری بیڑے کی تباہی اور ۱۷۹۹ء میں ٹیپو کی موت کے بعد اس قلعہ میں شکستگی کے آثار ظاہر ہوئے جس کے نتیجے میں ایشیا پر مغرب کا تسلط قائم ہوا۔ ہندو پریس یہ شرارت جعل سازی کے اس مقصد سے کر رہا ہے جسے اس نے یورپ سے پان اسلام ازم کا نام دینے کا سبق سیکھا ہے، ایک ایسا منصوبہ ہے جس کا وجود کہیں نہیں تھا سوائے مغرب کے متخیلہ کے۔ جس نے یہ اصطلاح ایجاد کی تا کہ یورپ کو اسلام سے خطرہ لاحق ہونے کا مضحکہ خیز نظریہ تشکیل دے سکے اور اسلامی ممالک کے خلاف اپنے جارحانہ عزائم کے جواز کے لیے استعمال کر سکے۔ یہ بد قسمتی کی بات ہے کہ ہندوستان اور دیگر ممالک کے

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلہ دریافت

مسلمانوں کی نوجوان نسل اپنی تاریخ کو یورپی اہلِ قلم سے اخذ کرتی ہے جن کی تحریریں سوائے سیاسی پرپیگنڈے کے کچھ نہیں ہوتیں۔ بعض اوقات یہ تحریریں عظیم علمی استفادہ اور بہ ظاہر بے ضرر ہوتی ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ایشیا کی اقوام، خصوصاً ایشیا کے مسلمان، ایشیا کی پوری تاریخ کا بغور مطالعہ کریں۔ یہی واحد طریقہ ہے جس سے وہ ان تاریخی اور معاشی قوتوں کے کردار کا صحیح اندازہ لگا سکیں گے جو فی زمانہ ایشیائی ممالک کے ارتقا کے لیے کام کر رہی ہیں۔

ٹیگور نے ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ ایک اور ناانصافی کی ہے۔ اس نے میسوپوٹیمیا[8] کے مسلمانوں سے کہا کہ وہ ہندوستان کی آزادی کے لیے ہندوستانی مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ تعاون کرنے پر راضی کریں۔ ہندوستانی سیاست پر گہری نظر رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ موجودہ حالات میں "مکمل آزادی" کسی بھی طور ہندوؤں کی خواہش ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ اس کا واحد مقصد ہندوستان کی اقلیتوں پر تسلط قائم کرنا اور اپنی حمایت کے لیے انگریز حکمرانوں کی موجودگی کو برقرار رکھنا ہے۔ یہ ہے اس کی آزادی کا مفہوم اور اس آزادی کا سیدھا سا مطلب ہندوستان کی اقلیتوں کے لیے آقاؤں کی تبدیلی ہے۔

آپ کی صحت کی امید کے ساتھ

آپ کا مخلص

محمد اقبال

تیسرا خط

۶ جولائی ۱۹۳۲ء

ڈاکٹر سر محمد اقبال

ایم اے، پی ایچ ڈی، بار ایٹ لا، لاہور

میرے پیارے جنابِ آرام!

آپ کے خط کا شکریہ جو میں نے آج پڑھا۔

مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ میرے پاس ان اشاعتوں کے تراشے نہیں ہیں جن کا ذکر میں نے اپنے آخری خط میں کیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ بمبئی کے ایک پارسی صحافی جنابِ نریمان[1] کو جانتے ہوں گے، وہ ایران میں زرتشت پسندی کے احیا کے پارسی پروپیگنڈے کی مخالفت کرتے ہیں اور بعض اوقات اس کے خلاف سرگرم رہتے ہیں۔ اگر مجھے ان سے مزید اخباری تراشے مل گئے تو میں بہ صد خوشی آپ کو بھیجوں گا۔ بعض اوقات ایرانی مسلمان ہندوستانی شہروں میں بھی یہی پروپیگنڈا کرتے ہیں، مثال کے طور پر کراچی میں، جہاں پارسیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ گذشتہ برس کراچی میں ایک ایسے ہی شریف آدمی پایا گیا۔

میرے خیال میں یہ "بمبے کرانیکل"[2] تھا جس نے ٹیگور کے دورے سے متعلق ایک مضمون لکھا تھا اور اس دورے کے اس اصل ہدف کو فاش کیا تھا، جو ہندومت اور ایران کے مابین آریائی تعلقات کو استوار کرنا تھا۔ "آریائی تعلقات کی استواری" ایک بے ضرر

تاثر ہے، لیکن ہم ہندوستانی مسلمان ان معاملات اور ان کے مضمرات کو غیر ملکیوں سے بہتر سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ، جرمنی میں ایرانی پناہ گزین بھی کچھ اسی طرح کی سرگرمیوں میں مصروف رہے ہیں۔ میں ان کی موجودہ سرگرمیوں کے بارے میں نہیں جانتا ہوں لیکن ان کی گذشتہ سرگرمیاں، جن کے نتائج ہندوستان میں شائع شدہ تحریروں کی شکل میں ملتے ہیں، اس امر کی نشان دہی کرتے ہیں۔

چند روز پہلے، جب میں پنجاب یونیورسٹی کے لیے فارسی زبان و ادب کے ایم اے کا امتحانی پرچہ تیار کر رہا تھا[3] تو میرے معاون ممتحن نے مجھے "ایرانشہر"[4] یا "کسریٰ"[5] سے ایک فارسی مضمون فراہم کیا۔ اس کے مصنف کوئی ایرانی تھے جن کا خیال تھا کہ ایرانیوں کو زبردستی اسلام کی طرف راغب کیا گیا تھا۔ میرے معاون ممتحن کا خیال تھا کہ مضمون کو ہمارے گریجویٹ طلباء کو انگریزی میں ترجمہ کے لیے دیا جائے لیکن میں نے اسے مسترد کر دیا اور کسی دوسرے متن کا انتخاب کیا۔ ایسے ایرانی حضرات یا تو اپنے ملک کی تاریخ سے بالکل ہی لاعلم ہیں یا یورپی سیاستدانوں اور پروپیگنڈا کرنے والوں کا کھلونا ہیں جن کا واحد مقصد ہے کہ مسلمان ممالک ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کے احساس سے محروم ہو جائیں۔ مسلمان ممالک ایک دوسرے کو نظرانداز نہیں کر سکتے کیونکہ ابھی تک اہلِ یورپ کی جارحیت تھم نہیں پائی ہے۔ شاید انھیں ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کرنے کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ آج ہے۔ میری رائے میں، اس طرح کے پروپیگنڈے کا محرک اس حقیقت کا ادراک ہے کہ ایشیا میں مسلم ممالک کے مابین نئے اور جدید خطوط پر استوار تعلقات ان کو باہمی طور پر زیادہ مضبوط بنا دیں گے۔ اس کا مقصد موجودہ دور میں اسلام کے عروج کے کسی بھی امکان کو روکنا ہے، جب یورپی سامراج کا خاتمہ یقینی ہو چکا ہے۔ اسلام کا عروج خاص طور پر اس لیے پریشان کُن ہے کیونکہ ایشیا میں اسلام کم از کم یورپ کے حریفوں میں سے ایک ہے اور ہندو اپنے فرقہ وارانہ مقاصد اور خواہشات کے لیے مسلم ممالک کے خلاف اس طرح کے پروپیگنڈے میں خصوصی دلچسپی ظاہر کرتے ہیں۔

ہندوستانی پریس میں ترکی میں اصلاحات کے بارے میں یورپی خبریں بڑی بڑی شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوتی ہیں بلکہ اس طرح سے ہندوستانی مسلمانوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ تُرک اسلام کو بے گھر کر رہے ہیں۔ امان اللہ[6] کی حمایت افغانستان میں ان کی اصلاحات کی وجہ سے نہیں تھی، بلکہ اس لیے کہ ان کا خیال تھا کہ ان کی اصلاحات کا مقصد اسلام کو افغانستان سے بے دخل کرنا ہے۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہی پراپیگنڈا ہی امان اللہ اور انقلابِ افغان کے زوال کا سبب ثابت ہوا۔

اگر میری کبھی آپ سے ذاتی طور پر ملاقات ہوئی تو میں آپ کو ہندو پریس کے مذموم منصوبوں کے بارے میں مزید تفصیلات بتاؤں گا۔ براہِ کرم اس خط[7] کو مکمل طور پر صیغہ راز میں رکھیں البتہ آپ اسے قونصل جنرل کو دکھا سکتے ہیں۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلہ
دریافت

چوتھا خط

۱۳جولائی ۱۹۳۲ء

ڈاکٹر سر محمد اقبال

بار ایٹ لا،لاہور

میرے پیارے جنابِ آرام!

آپ کے خط کا شکریہ۔ میں آپ کی توجہ کے لیے کچھ مزید مواد لف کر رہا ہوں۔ نریمان صاحب کا مراسلہ قطعی طور پر رازدارانہ ہے اور اسے صیغہ راز ہی میں رکھنا ضروری ہے۔ تقی زادہ[1] کو میں جانتا ہوں اور اس کا بہت مداح ہوں۔ ممکن ہے ہندوستان کے اکثر مسلمانوں کی طرح میرے پاس بھی درست معلومات نہ ہوں لیکن جو کچھ کہہ رہا ہوں شاید اس سے یہ نشان دہی ہو سکے کہ ایران سے متعلق مسلمانوں کا رویہ کس طرح متاثرہ ہے۔ پروپیگنڈہ کے اہداف ہمیشہ ترقی کے حصول کے لیے ہوتے ہیں، لیکن ساتھ ہی اس کے بہت سے نقصانات بھی ہیں اور ممکن ہے کہ غیر متوقع واقعات ظہور پذیر ہوں۔ بہتر ہے کہ برائی کو جڑ سے اکھاڑ دیا جائے۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

غلام عباس آرام کے نام مذکورہ چار خطوط کے علاوہ ۱۱جولائی ۱۹۳۲ء کو رقم کیا گیا ایک پانچواں خط بھی بہت اہمیت کا حامل ہے جس کے مکتوب الیہ خود علامہ محمد اقبال ہیں۔یہ خط ایک پارسی مصنف گستاسپ شا کیخسرو نریمان (۱۸۷۳ء–۱۹۳۳ء) کا ہے۔ نریمان صاحب کا شمار بھی علامہ اقبال کے احباب میں ہوتا تھا اور ان کے ساتھ خط وکتابت کا سلسلہ بھی رہتا تھا۔ وہ ایک صحافی اور ادیب تھے جو سنسکرت اور فارسی زبانوں کے بھی ماہر تھے۔انھوں نے ایران کی تہذیب وثقافت پر کئی تصانیف رقم کیں اور وہ ایران پر اسلامی اثرات کے بہت مداح تھے۔

آپ کی لائق ذکر تصانیف درج ذیل ہیں:

۱۔ سنسکرت بدھ مت کی ادبی تاریخ(*Literary history of Sanskrit Buddhism*)

۲۔ سرزمینِ فارس اور پارسی(*Persia & Parsis*)

۳۔ اہلِ ایران کا مذہب(*The Religion of the Iranian peoples*)

ذیل میں گستاسپ شا کیخسرو نریمان کے نام مکتوبِ اقبال کا متن ملاحظہ ہو:

(بہ صیغہ راز)

جی۔کے نریمان (صحافی)

میسگون، پی او،۱۰۔ بمبئی

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلہ
دریافت

۱۱جولائی ۱۹۳۲ء

میرے پیارے سر محمد اقبال!

آپ کا آٹھ جولائی کا خط واقعی خوش کن ہے۔

میں نے جاوید نامہ کو ایک مسلم دوست کی درخواست پر اس کے سپرد کیا تھا، جس نے مجھے درپیش پیچیدگیوں کے حل میں مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ شریف آدمی نہ تو مجھے دوبارہ ملا اور نہ ہی کتاب مجھے واپس کی، حالانکہ میں نے اسے ایک یاددہانی کا خط بھی بھیجا تھا۔ میری بڑی خواہش ہے کہ اس غنائیہ نظم یا مذہبِ زرتشت کی رُو سے اس کو جو بھی نام دیں، انگریزی زبان میں شائع کروں۔

ایران میں زرتشتی مذہب کے دوبارہ ابھرنے کے پروپیگنڈے کے بارے میں، میری خواہش ہے کہ جن مسلم دوستوں کو میں نے گزارش کی تھی، کاش انھوں نے کوئی مناسب اقدامات کیے ہوتے۔ یقیناً ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی، لیکن ہم جتنا زیادہ تاخیر کریں گے، نہ صرف زرتشتی مذہب کے عروج کو روکنے میں، بلکہ منافقت کو بھی روکنے میں کامیابی کم ہو گی، اور میرے سابقہ خطوط آپ پر یہ ثابت کر دیں گے کہ میں نے ایران کے انتہاپسند مسلمانوں اور متظاہر ایرانیوں کے مقاصد کی نشان دہی کے لیے کتنا کام کیا۔ ایرانی حکام کی نظریں پارسیوں کی دولت پر لگی ہوئی ہیں۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے انھوں نے اس دولت کے میزان کے متعلق بہت مبالغہ آرائی کی ہے۔ پارسیوں کو ایران میں ہجرت کی ترغیب دلانے کے مقصد کے پیشِ نظر اُن کو یہ بتایا گیا ہے کہ ایران زرتشت مذہب کو دوبارہ اپنانے کے لیے تیار ہے اور پارسیوں کی واپسی کے ساتھ ہی مساجد آتش کدوں میں تبدیل ہو جائیں گی۔ ان کے علاوہ یہ افواہیں بھی ہیں کہ کچھ پارسی اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ رضا شاہ(1) نے مذہبِ زرتشت کی ظاہری علامات یعنی سُدرہ اور کُستی(2) باندھنے کا عزم کیا ہوا ہے۔ ایران کے کچھ ایجنٹس بھی یہی خبر سنانے پارسیوں کے پاس آئے تھے، جن میں سب سے زیادہ بدنام سیف آزاد(3) تھا۔ میں اس کے بارے اپنے گذشتہ خطوط میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ خود میری چھوٹی سی جماعت کی مخالفت کے پیشِ نظر مذہب کی تبدیلی کے متعلق پروپیگنڈہ وقتی طور پر اور عوامی سطح پہ عملاً ترک کر دیا گیا ہے۔ یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ کسی بھی طرح ایران کے خلاف سازشوں کا حصہ نہیں تھا تاہم مجھے اس کے بارے میں شبہات ہیں اور خوش قسمتی سے، میرے پاس مسلمان ایرانیوں کو زرتشتی بنانے کے منصوبے کے بارے میں پارسی اخبارات میں شائع ہونے والے ثبوت موجود ہیں۔ اس سلسلے میں، میں آپ کو ایران کے اعلیٰ عہدیداروں سے خط وکتابت ارسال کر رہا ہوں۔ اس مسئلے پر پارسی پریس میں میرے خلاف مختلف ردعمل سامنے آیا ہے اور تہران کے دوغلے لوگ مجھ پر برہم ہو گئے۔ ان دھوکہ باز لوگوں میں سے ایک رہنما کا خط میرے سامنے ہے۔ وہ اپنی فتح پر فخر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"اب مسلمانوں کی مساجد میں دینِ محمدی کے مبلّغ ایران کے قدیم مذہب کی بات کرتے ہیں۔۔۔"

اعلیٰ ترین عہدے داروں کے نام اپنے خط کے علاوہ ایک مراسلے کی نقل بھی آپ کو بھیج رہا ہوں جو میں نے Times of India میں اشاعت کے لیے بھیجا تھا۔ اس سے قبل میں نے آپ کو اپنی مشکلات سے آگاہ کیا تھا۔ بمبئی کے اخبارات متمول پارسیوں کے زیرِ اثر ہیں جن میں سے اکثر متعصب قسم کے افراد ہیں۔ اس لیے حقیقی اور سچے خیالات کو پیش کرنے میں میرے ہاتھ بندھے ہیں۔ حتیٰ کہ پارسی اخبارات میں اپنے خلاف جھوٹی خبروں کا جواب تک دینے سے قاصر ہوں۔

ٹیگور کا دورہ ایران ایک مضحکہ خیز ڈرامہ تھا۔ یہ پارسی متعصبوں کی مدد سے لایا گیا۔ یہ ہوشیار بنگالی جنوبی پارسیوں پر سبقت لے گیا ہے۔ "Fox, Monkey and Cuckoo" کے عنوان سے میں نے جو مضمون لف کیا ہے، اسے پڑھ کر آپ اس معاملے کو سمجھ جائیں گے۔ میں نے یہ مضمون متعدد اخبارات کو بھیجا، لیکن ان میں سے ابھی تک کہیں بھی شائع نہیں ہوا ہے۔

میں اپنا مقصد واضح کر دوں۔ میرا موقف ہے کہ یہ واویلا کرنا ایک تاریخی گمراہی ہے کہ پارسیوں نے عرب مسلمانوں کے دباؤ اور جارحیت کی وجہ سے ایران کو چھوڑ دیا۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ ایران کا اسلام قبول کرنا زرتشتی رہنماؤں اور روحانی پیشواؤں کے جابرانہ ظلم کی وجہ سے ہوا تھا۔ تیسرا، میں سمجھتا ہوں کہ ایران میں زرتشتیوں پر ظلم و جبر عرب کے ذریعہ نہیں بلکہ ان زرتشتیوں کی بدولت ہوا تھا جنھوں نے دنیاوی لالچ سے اسلام قبول کیا تھا اور وہ یہ نہیں برداشت کر سکے تھے کہ ان کے رشتہ دار اور پڑوسی اپنے سابقہ دین پر قائم رہیں۔ لہٰذا، جب میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک پرانا معاملہ پھر اٹھایا گیا ہے اور ایرانی حکومت بھی تاریخی گمراہیوں کی تائید کر رہی ہے ، میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ میں سچائی سے پردہ اٹھاؤں، ضروری نہیں کہ اسلام کے تناظر میں بلکہ تاریخی حقائق کے تناظر میں۔ فروغی[4] کی ٹیگور کو بہ طور معاوضہ ایرانی ثقافت کا ایک مرکز قائم کرنے اور مصیبت زدہ پارسیوں کی مدد کی پیشکش ناقابلِ تلافی نہیں ہو سکتی۔

پیارے دوست! میرے خیال میں آپ سیاست کا رخ کر کے کسی دوسری سمت چل پڑے ہیں۔ میری خواہش ہو گی کہ آپ تاریخ اور فلسفہ کے میدان میں واپس آجائیں۔ دنیا پر یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اسلام بہت سے پہلوؤں سے ایران کا نجات دہندہ تھا، میں آپ کے ساتھ مل کر کام کر سکتا ہوں۔ اگرچہ میں دینِ محمد کا پیروکار نہیں ہوں، لیکن تاریخی حقائق کی ترویج و اشاعت پر یقین رکھتا ہوں۔

آپ کا مخلص

جی۔کے۔نریمان

غلام عباس آرام کے نام مکاتیبِ اقبال سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ایک علمی شخصیت تھے جن کی شعر و ادب، تصوف اور فلسفے سے خصوصی دلچسپی تھی لیکن ایرانی سماج میں ان کی شناخت ایک فری میسن(*Freemason*) کے طور پر ہے۔ فری میسن سے مراد ایسے افراد ہیں جو نوآبادیاتی خطوں میں استعماری طاقتوں کے ہتھیار سمجھے جاتے ہیں اور ان کے بارے میں مذہبی طبقات میں منفی خیالات پائے جاتے ہیں۔

علم و ادب سے دلچسپی کی بنیاد پر اقبال نے انھیں اپنی چند تصانیف بشمول "Six Lectures" بہ طور تحفہ ارسال کیں۔ یہ واضح نہیں ہے کہ اقبال نے ان کو جو دیگر کتب بھیجیں، وہ فارسی تصانیف تھیں یا ان میں اردو تصانیف بھی شامل تھیں البتہ انھوں نے اردو مجلہ "نیرنگِ خیال" لاہور کا وہ شمارہ بھی ارسال کرنے کا وعدہ کیا جو اقبال کے حوالے سے خصوصی اشاعت پر مبنی تھا۔ اس سے یہ اشارہ ضرور ملتا ہے کہ غلام عباس آرام کی اردو زبان سے شناسائی بھی تھی۔

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

اس کے علاوہ حافظ شیرازی کے کلام کے اردو ترجمے کے بارے میں اقبال کا بتانا بھی یہ واضح کرتا ہے کہ یہ آرام کے کسی استفسار کا جواب ہے۔ اس نکتے سے بھی ان کی اردو سے آگاہی کا ثبوت ملتا ہے۔ مولانا ظفر علی خان کے اخبار "زمیندار" کے ایک نوٹ کے بارے میں اقبال نے انھیں بتایا کہ وہ دیکھ چکے ہیں۔ یہ بھی عباس آرام کے کسی استفسار ہی کا جواب ہے۔

اقبال نے اپنے دوسرے خط میں عباس آرام سے ان پر رقم کی جانے والی انگریزی تالیف "A VOICE FROM THE EAST" کی دستیابی کی صورت میں ارسال کرنے کا وعدہ کیا۔ اسی طرح اردو میں پہلی تنقیدی کتاب "اقبال" مصنفہ احمد دین کے بارے میں جس پیرائے میں بتایا ہے، اس سے لگتا ہے کہ اقبال کی تصانیف موصول ہونے کے بعد انھوں نے اس کا تقاضا کیا لیکن وہ بھی دستیاب نہ تھی۔

عباس آرام کو نہ صرف اقبال نے کتب تحفے میں بھیجیں بلکہ ان کی تصوف میں دلچسپی کی بنیاد پر انھیں اس سے متعلق بعض تصانیف سے متعارف کروایا۔ وہ لکھتے ہیں:

> "تصوف کے بارے میں اگر آپ عربی میں ابو طالب مکی کی کتاب "قوت القلوب" کو پڑھ چکے ہیں تو، یہ تصوف کے بارے میں سب سے قدیم اور سبق آموز کام ہے۔ اس کے بعد کی تصنیف "کشف المحجوب" سید علی ہجویری کی ہے، جو لاہور کے ایک عظیم صوفی ہیں اور اصلاً غزنی کے ہیں۔ اس کتاب کا انگریزی میں مختصر ترجمہ ڈاکٹر نکلسن نے کیمبرج میں شائع کیا تھا۔ میرے خیال میں یہ کتاب لوزاک سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ عراقی کی "لمعات" کو محی الدین العربی کی "فتوحاتِ مکیہ" کے مطالعے کے بغیر مکمل طور پر سمجھا نہیں جاسکتا۔"(۱)

اس اقتباس سے اس امر کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ اقبال اور آرام کے مابین ان دریافت شدہ مکاتیب سے قبل بھی کچھ مراسلت ہو چکی ہے جس سے اقبال اس امر سے آگاہ ہوئے کہ وہ تصوف کے بارے میں کوئی کتاب پہلے پڑھ چکے ہیں۔

اقبال نے غلام عباس آرام کو نہ صرف تصوف سے متعلق کتب کے بارے میں بتایا بلکہ مولانا رومی کی تخلیقات اور ان کے تراجم سے بھی نہایت والہانہ پن سے آگاہ کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> "سب سے بڑھ کر رومی کی مثنوی ہے، جسے میں ذاتی طور پر کسی بھی دوسری کتاب پر ترجیح دیتا ہوں۔ ڈاکٹر نکلسن نے پوری کتاب کا مکمل انگریزی ترجمہ اپنے اصل فارسی متن کے ساتھ شائع کیا، جسے انہوں نے مصر میں دریافت ہونے والے مخطوطے کا مقابلہ کرنے کے بعد احتیاط اور بہت توجہ سے تصحیح کی تھی۔ یہ مخطوطہ رومی کی وفات کے ۵۰ سال بعد لکھا گیا تھا اور یہ شاید باقی بچ جانے والا قدیم ترین نسخہ ہے۔ دریاباد، بارہ بنکی ضلع (متحدہ صوبے، ہندوستان) سے گریجویٹ جناب عبد الماجد نے رومی کی کتاب "فیہ مافیہ

"کی تدوین اور شائع کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ انھیں لکھتے ہیں تو وہ آپ کو ایک کاپی بھیجیں گے۔ ہندوستان میں اب بھی مثنوی رومی کے بہت سارے قارئین ہیں اور ہندوستان میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں میں سے ایک ہے۔ دیوانِ شمس کے عنوان سے رومی کے بعض اشعار کا بھی نکلسن نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔" (۲)

اگرچہ اقبال نے تصانیف کے ساتھ ان کے ترجموں کا ذکر بھی کیا ہے لیکن ان مکاتیب میں وہ شاعری کی کسی کتاب کا ترجمہ کرنے کے عمل پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ حافظ شیرازی کے اردو اور پنجابی تراجم کے سلسلے میں اپنا نقطہ نظر یوں بیان کرتے ہیں:

"میں نے حافظ کے بارے میں میر ولی اللہ کی کتاب کے کچھ حصے پڑھے ہیں۔ وہ فارسی زبان کے ایک اچھے محقق ہیں اور بہ طور شارح عمدہ کام کیا ہے، لیکن میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں شاعری کی شرح پر زیادہ یقین نہیں رکھتا ہوں۔ کئی برس پہلے کسی نے حافظ کے دیوان کا پنجابی میں ترجمہ کیا تھا۔ مجھے یہ ترجمہ ہندوستان میں رقم کی گئی کلامِ حافظ کی کسی بھی شرح سے زیادہ پسند آیا۔ تاہم، ولی اللہ کی تشریح مجموعی طور پر اچھی ہے۔" (۳)

ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور مسلم مفادات کے لیے اقبال نے ہمہ جہت انداز میں کام کیا۔ ان کی ان عملی کاوشوں کا عکس ان کی شاعری میں بھی نمایاں ہے۔ انھیں اس امر کا بھرپور احساس تھا کہ نہ صرف ہندوستانی مسلمان بلکہ تمام اہلِ ایشیا بیرونی طاقتوں کے غلام ہیں اور غلامی سے نجات دلانے کے لیے انھیں اپنے تخلیقی عمل کو بروئے کار لانا ہے۔ ان کی نگاہِ بصیرت حالات کے تغیر کا مشاہدہ کر رہی تھیں جس کا اظہار انھوں نے اپنے متعدد اشعار میں کیا ہے۔

پھر اٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی
زمیں جولاں گہِ اطلس قبایانِ تتاری ہے (۴)

ہورہا ہے ایشیا کا خرقہ دیرینہ چاک
نوجواں اقوامِ نو دولت کے ہیں پیرایہ پوش (۵)

اعجاز ہے کسی کا یا گردشِ زمانہ
ٹوٹا ہے ایشیا میں سحرِ فرنگیانہ (۶)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

" زمیندار" اخبار کے ایک نوٹ کے حوالے سے غلام عباس آرام کے نام خط میں اقبال اس دکھ کا اظہار کرتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمان ایک عرصے سے غلام ہیں لیکن وہ پر اُمید بھی ہیں کہ اب حالات تبدیلی کی جانب گامزن ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہندوستانی مسلمان ۱۸۵۷ سے عملی طور پر جیل میں ہیں۔ حالات اب تیزی سے بدل رہے ہیں۔ تجارتی راستوں سے اب وسطی اور مغربی ایشیا کو بے حد معاشرتی، معاشی، سیاسی اور ثقافتی فوائد حاصل ہوں گے۔" (۷)

حالاتِ حاضرہ پر اقبال کی گہری نظر تھی۔ ہندوستان کے علاوہ ہمسایہ ممالک بہ طورِ خاص ایران اور افغانستان کے سیاسی و سماجی معاملات کو وہ باریک بینی سے دیکھتے اور تقریری و تحریری طور پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے رہے۔ ایران سے ان کا قلبی ربط تہذیبی اور ادبی دونوں سطحوں پر تھا۔ اقبال کی تخلیقی کاوشوں میں فارسی کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ فارسی زبان کی اہمیت تو علامہ اقبالؒ کی نثر و شاعری میں واضح ہے۔ جیسا کہ خود انھوں نے فرمایا تھا کہ:

پارسی از رفعتِ اندیشہ ام
در خورد بافطرتِ اندیشہ ام (۸)

وہ غالب کی طرح فارسی کے مقابلے میں اپنی اردو تخلیقات کو دوسرے درجے کی تو خیال نہیں کرتے تھے لیکن انھوں نے فارسی میں نہایت اہم منظومات تخلیق کی ہیں جن کے فکر و فن کی عظمت کا اعتراف اہلِ زبان بھی کرتے ہیں۔ اسی طرح ایران اور اہلِ ایران کے ساتھ اقبال کی وابستگی کئی سطحوں پر تھی۔ علامہ اقبالؒ کی نظر میں ایران کی اہمیت کا اندازہ اُن کی بیاض کے اس مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

" اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ تاریخ اسلام کا اہم ترین واقعہ کون سا ہے تو میں بے تامل کہوں گا: 'فتح ایران'۔ نہاوند کی جنگ نے عربوں کو ایک حسین ملک کے علاوہ ایک قدیم تہذیب بھی عطا کی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ ایسی قوم سے روشناس ہوئے جو سامی اور آریائی عناصر کے امتزاج سے ایک نئی تہذیب کو جنم دے سکتی تھی۔ ہماری مسلم تہذیب سامی اور آریائی تصورات کی باہمی پیوند کاری کا حاصل ہے۔ گویا یہ ایسی اولاد ہے جسے آریائی ماں کی نرمی و لطافت اور سامی باپ کے کردار کی پختگی و صلابت سے ورثے میں ملی ہے۔ فتحِ ایران کے بغیر اسلامی تہذیب یک رخی رہ جاتی۔ فتح ایران سے ہمیں وہی کچھ حاصل ہو گیا جو فتحِ یونان سے رومیوں کو ملا تھا"۔ (۹)

اگرچہ علامہ اقبالؒ نے اپنی زندگی میں کبھی ایران کا سفر نہیں کیا لیکن اُنھیں اپنے عہد کے ایران کے حالات و واقعات اور ملّتِ ایران کی زبوں حالی کی بابت بنیادی اور گہری معلومات تھیں۔

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

عباس آرام کے نام مکاتیب میں اہم ترین مسئلہ ایران میں زرتشت مذہب کے احیا کی اُس تحریک پر رد عمل ہے، جسے کسی حد تک سرکاری سرپرستی بھی حاصل تھی۔ اقبال دیکھ رہے تھے کہ اہل ایران کو مختلف طریقوں سے یہ باور کرایا جارہا تھا کہ ان کا اصل مذہب زرتشتیت ہے اور ان کے حق میں بہتر یہی ہے کہ وہ اسلام کو ترک کر کے دوبارہ اپنے اصل دین کو اختیار کر لیں۔

اہلِ ایران کے دوبارہ زرتشتی مذہب کو اختیار کرنے یا کرانے کے سلسلے میں اخبارات میں بہت کچھ شائع ہو رہا تھا اور ایک پارسی صحافی نریمان کے ساتھ اقبال کی علمی بات چیت بھی جاری تھی۔ عباس آرام کو اقبال کچھ اخباری تراشے بھیجنا چاہتے تھے لیکن انھیں دستیاب نہ تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ میرے پاس ان اشاعتوں کے تراشے نہیں ہیں جن کا میں نے اپنے آخری خط میں ذکر کیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ بمبئی کے ایک پارسی صحافی جنابِ نریمان کو جانتے ہوں گے، وہ ایران میں زرتشت پسندی کے احیا کے پارسی پروپیگنڈے کی مخالفت کرتے ہیں اور بعض اوقات اس کے خلاف سرگرم رہتے ہیں۔ اگر مجھے اس سے مزید اخباری تراشے مل گئے تو میں بہ صد خوشی آپ کو بھیجوں گا۔ بعض اوقات ایرانی مسلمان ہندوستانی شہروں میں بھی یہی پروپیگنڈا کرتے ہیں۔" (۱۰)

ایران میں زرتشتی مذہب کے احیاکے سلسلے میں مختلف سطح کے ثقافتی اقدامات بھی کیے گئے۔ ان میں سے ایک ٹیگور کا دورہ بھی تھا۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے ایرانی حکومت کی دعوت پر ۱۹۳۲ء میں ایران کا دورہ کیا۔ ان کے ساتھ بنگالی دانشوروں کا ایک چھوٹا سا وفد بھی تھا، جن میں امیہ کمار چکرورتی اور کیدار ناتھ چٹوپادھیائے بھی شامل تھے۔

اقبال کے نزدیک ٹیگور کا یہ دورہ نہایت ناپسندیدہ تھا۔ انھیں اس بات کا رنج ہوا کہ ٹیگور نے نہ صرف ایران میں اسلام کو ضرر پہنچانے کی کوشش کی بلکہ ہندوستان میں تحریکِ آزادی کے سلسلے میں بھی انھوں نے ہندو مفادات کی طرف جھکاؤ ظاہر کیا۔ ٹیگور کے دورہ ایران کے اصل مقاصد کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

> " میرے خیال میں یہ "بمبے کرانیکل" تھا جس نے ٹیگور کے دورے سے متعلق ایک مضمون لکھا تھا اور اس دورے کے اس اصل ہدف کو فاش کیا تھا، جو ہندو مت اور ایران کے مابین آریائی تعلقات کو استوار کرنا تھا۔ "آریائی تعلقات کی استواری" ایک بے ضرر تاثر ہے، لیکن ہم ہندوستانی مسلمان ان معاملات اور ان کے مضمرات کو غیر ملکیوں سے بہتر سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ، جرمنی میں ایرانی پناہ گزین بھی کچھ اسی طرح کی سرگرمیوں میں مصروف رہے ہیں۔ میں اس وقت ان کی سرگرمیوں کے بارے میں نہیں جانتا ہوں لیکن ان کی گذشتہ سرگرمیاں، جن کے نتائج ہندوستان میں شائع شدہ تحریروں کی شکل میں ملتے ہیں، اس امر کی نشان دہی کرتے ہیں۔" (۱۱)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

یہ ایک عجیب امر ہے کہ جب ایران میں مذہبِ زرتشت کے احیا کی کاوشیں ہو رہی تھی تو عین اس وقت ہندوستان میں بھی شدھی اور سنگٹھن کی تحاریک کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں کو یہ باور کرایا جارہا تھا کہ ان کا اصل مذہب ہندومت ہے اور انھیں اپنی اصل کی طرف مراجعت اختیار کرنی چاہیے۔

شدھی تحریک(purity, cleanness)ہندو بنانے اور ہندو مذہب میں داخل کرنے کی تحریک کو گھر واپسی تحریک بھی کہتے ہیں۔ شدھی سے مراد یہ ہے کہ جن لوگوں کے آباواجداد مسلمان ہو گئے تھے، انہیں دوبارہ شدھ یعنی پاک کر کے ہندو بنایا جائے۔ اسی طرح سنگٹھن تحریک کا مقصد بھی ہندوستان کو مکمل طور پر ہندو بنانا اور غیر مذہبوں کو یہاں سے نکالنا تھا۔ اس تحریک کے دائرہ کار میں دیگر مذاہب کے ماننے والوں کو ہندو یعنی شدھ بنانا ہی نہیں تھا بلکہ ہندومت قبول نہ کرنے کی صورت میں انہیں سنگٹھن یعنی قتل کرنا بھی تھا۔ ایران میں مذہبِ زرتشت کی طرف اہلِ ایران کی مراجعت یا اس سلسلے میں بعض کاوشوں کی صورت کم و بیش وہی تھی جو ہندوستان میں شدھی کی تھی۔

مذہبِ زرتشت کی طرف اہلِ ایران کو مائل کرنے کے سلسلے میں خود ایرانی سرکار کی کیا دلچسپی تھی۔ اس بارے میں کیا ثقافتی کاوشیں ہو رہی تھیں نیز اس حوالے سے کون لوگ زیادہ متحرک تھے۔ اقبال نے مذکورہ جملہ معاملات کی تفصیل کے لیے غلام عباس آرام کے نام ایک خط میں انھیں پارسی صحافی اور ادیب جی۔ کے۔ نریمان کا ایک خط بھی بھیجا اور گزارش کی کہ اسے صیغہ راز میں رکھا جائے۔

مذکورہ خط کی تفصیلات دیکھی جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جی۔ کے۔ نریمان باوجود پارسی ہونے کے اہلِ ایران کی زرتشتی مذہب کی طرف واپسی کے سخت خلاف تھے اور حقائق کو اجاگر کرنے کے سلسلے میں وہ اور ان کی جماعت نہایت کوشاں تھے۔ وہ اس بارے میں نہ صرف مسلسل لکھ رہے تھے بلکہ عملی سطح پر کاوشیں بھی کر رہے تھے۔ بمبئی کے اخبارات پر متمول پارسی طبقے کا اثر ہونے کی وجہ سے جی۔ کے۔ نریمان کی بعض تحریریں اشاعت پذیر ہونے سے روک بھی دی جاتی تھیں۔

جی۔ کے۔ نریمان کی مذکورہ کاوشوں کی وجہ سے انھیں شدید مخالفت اور پارسی برادری کی طرف سے دباؤ کا بھی سامنا تھا لیکن وہ ثابت قدم تھے۔ وہ اپنے خط میں ٹیگور کے دورہ ایران اور اہلِ ایران کے قبولِ اسلام کے سلسلے میں جارحانہ رویوں کے حوالے سے غلط پراپیگنڈے کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

> "ٹیگور کا دورہ ایران ایک مضحکہ خیز ڈرامہ تھا۔ یہ پارسی متعصبوں کی مدد سے لایا گیا۔ یہ ہوشیار بنگالی جنونی پارسیوں پر سبقت لے گیا ہے۔ "Fox, Monkey and Cuckoo" کے عنوان سے میں نے جو مضمون لف کیا ہے، اسے پڑھ کر آپ اس معاملے کو سمجھ جائیں گے۔ میں نے یہ مضمون متعدد اخبارات کو بھیجا، لیکن ابھی تک کہیں بھی شائع نہیں ہوا ہے۔ میں اپنا مقصد واضح کر دوں۔ میرا موقف ہے کہ یہ واویلا کرنا ایک تاریخی گمراہی ہے کہ پارسیوں نے عرب مسلمانوں کے دباؤ اور جارحیت کی

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

وجہ سے ایران کو چھوڑ دیا۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ ایران کا اسلام قبول کرنا زرتشتی رہنماؤں اور روحانی پیشواؤں کے جابرانہ ظلم کی وجہ سے ہوا تھا۔ تیسرا، میں سمجھتا ہوں کہ ایران میں زرتشتیوں پر ظلم و جبر عرب کے ذریعہ نہیں بلکہ ان زرتشتیوں کی بدولت ہوا تھا جنہوں نے دنیاوی لالچ سے اسلام قبول کیا تھا اور وہ یہ نہیں برداشت کر سکے تھے کہ ان کے رشتہ دار اور پڑوسی اپنے سابقہ دین پر قائم ہیں۔" (۱۲)

مذہبی حوالے سے مذکورہ پراپیگنڈوں کی وجہ سے ایران کی نئی نسل کے بعض گمراہ کن افکار پر اقبال دکھ کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ اپنی تاریخ و تہذیب سے آشنا نہیں اور مغربی ذرائع ابلاغ سے جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔ اہلِ ایران کی اس غفلت پر وہ یوں طنز کرتے ہیں:

"ایرانی حضرات یا تو اپنے ملک کی تاریخ سے بالکل ہی لاعلم ہیں یا یہ یورپی سیاستدانوں اور پروپیگنڈا کرنے والوں کا کھلونا ہیں جن کا واحد مقصد ہے کہ مسلمان ممالک ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کے احساس سے محروم ہو جائیں۔ مسلمان ممالک ایک دوسرے کو نظر انداز نہیں کر سکتے ہیں کیونکہ ابھی تک اہلِ یورپ کی جارحیت تھم نہیں پائی ہے۔۔شاید آج پہلے سے کہیں زیادہ، انھیں ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کرنے کی ضرورت ہے۔ میری رائے میں، اس طرح کے پروپیگنڈے کا محرک اس حقیقت کا ادراک ہے کہ ایشیا میں مسلم ممالک کے مابین نئے اور جدید خطوط پر استوار تعلقات ان کو باہمی طور پر زیادہ مضبوط بنا دیں گے۔" (۱۳)

اقبال نہ صرف یورپی پراپیگنڈے کا پردہ چاک کرتے ہیں بلکہ ہندوستان کے مقامی پریس کے کردار پر بھی اس حوالے سے اپنی ناپسندیدگی ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہندوستانی صحافت کسی احساسِ کمتری یا غلط فہمی کا شکار ہے کہ وہ نہ صرف ایران بلکہ ترکی کے حوالے سے بھی خبروں کو ایک خاص زاویہ دیتے ہیں جس سے فکری گمراہیاں جنم لیتی ہیں۔

اقبال بہ یک وقت ترکوں کے مداح اور ناقد تھے۔ کمال اتاترک کی اصلاحات ان کے لیے پسندیدہ تھیں لیکن ان اصلاحات کے حوالے سے بعض شکایات بھی انھوں نے کیں۔ ان کے نزدیک اصلاحات کا حاصل لادینیت نہیں ہونا چاہیے۔ ہندوستانی پریس جب یورپ کے زیرِ اثر ترک اصلاحات کو ترکی سے اسلام کے دیس نکالا کا تاثر دیتا تھا تو انھیں اس کا شدید رنج ہوتا تھا۔ غلام عباس آرام کے نام لکھتے ہیں:

"ہندوستانی پریس میں ترکی میں اصلاحات کے بارے میں یورپی خبریں بڑی بڑی شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوتی ہیں بلکہ اس طرح سے ہندوستانی مسلمانوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ تُرک اسلام کو بے گھر کر رہے ہیں"(۱۴)

ترکی کی طرح افغانستان میں آنے والی سیاسی و سماجی تبدیلیوں پر بھی اقبال کی نگاہ تھی۔ انقلابِ افغانستان کے بعد امان اللہ خان کی اصلاحات ایک اعتبار سے اتاترک کی پیروی ہی تھیں۔ اقبال کے نزدیک یہ سماجی اقدامات اور ان کے لیے نافذ کیے جانے والے قوانین مغرب سے مرعوبیت کا نتیجہ اور غیر اسلامی ہیں۔ اہلِ یورپ نے امان اللہ کی سرپرستی بھی ایک خاص مقصد سے کی لیکن بعد میں روس کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کی وجہ سے اس کے خلاف پراپیگنڈا بھی اس انداز سے کیا کہ اس کا انجام امان اللہ خان کے سیاسی زوال اور جلاوطنی کی صورت میں سامنے آیا۔ اقبال لکھتے ہیں:

"امان اللہ کی حمایت افغانستان میں ان کی اصلاحات کی وجہ سے نہیں تھی، بلکہ اس لیے
کہ ان کا خیال تھا کہ ان کی اصلاحات کا مقصد اسلام کو افغانستان سے بے دخل کرنا ہے۔
مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہی پراپیگنڈا ہی امان اللہ اور انقلابِ افغان کے زوال کا
سبب ثابت ہوا۔" (۱۵)

غلام عباس آرام کے نام اقبال کے خطوط میں اُس دردمندی کا تسلسل نظر آتا ہے، جو اُن کی شعری تخلیقات اور دیگر نثری تحریروں میں واضح ہے۔ اقبال ہندوستان کے نوآبادیاتی مسائل کے ساتھ ساتھ ترکی، ایران اور افغانستان میں رونما ہونے والی تبدیلیوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان خطوط میں ایشیا کے جغرافیائی سیاسی مسائل کے سلسلے میں اقبال کے نقطہ نظر کا ایک نمایاں زاویہ دکھائی دیتا ہے۔

اقبال نے غلام عباس آرام کے نام ایران کے تہذیبی مسائل پر نہایت دردمندی سے گفتگو کی ہے اور اپنے مکتوب الیہ کو شواہد کے ساتھ حالات کا جائزہ اور اس پر اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔

ان مکاتیب کی اہمیت عہدِ اقبال کے معاصر عالمی سیاسی، سماجی اور تہذیبی معاملات کے سلسلے میں فزوں تر ہے کہ ان اوراق میں ایشیا خصوصاً ایران میں جاری ایک ایسی تحریک سے پردہ اٹھتا ہے جو کامیابی سے تو ہم کنار نہ ہو سکی لیکن اپنے وقت میں اہلِ ایران کے اذہان پر اپنے اثرات ضرور مرتب کر رہی تھی۔

حواشی

پہلا خط

1۔ علامہ اقبال کی ایک انگریزی کتاب *The Reconstruction of Religious Thought in Islam* جو ان کے سات خطبات کا مجموعہ ہے۔ پہلے چھے خطبات انہوں نے دسمبر ۱۹۲۸ء اور جنوری ۱۹۲۹ء کے درمیان مسلم ایسوسی ایشن، مدراس کی دعوت پر مدراس، حیدر آباد دکن اور علی گڑھ میں پڑھے تھے۔ یہ خطبات سب سے پہلے ۱۹۳۰ء میں "Six Lectures" کے عنوان سے شائع ہوئے جب کہ دوسری اشاعت (۱۹۳۴ء) میں ساتویں خطبے کا اضافہ کیا گیا۔

2۔ محمد بن علی بن عطیہ ابو طالب مکی اہل جبل سے تھے پھر مکہ میں مستقل رہائش رکھی اور اسی سے مکی منسوب ہیں۔ ان کی وفات ۳۸۶ھ میں بغداد میں ہوئی اور مقبرہ مالکیہ میں مدفون ہوئے۔ قوت القلوب في معاملتہ المحبوب المعروف بہ "قوت القلوب" آپ کی بہت ہی جامع تصنیف ہے۔ اس کا پورا نام قوت القلوب فی معاملتہ المحبوب ووصف طریق المرید الیٰ مقام التوحید ہے۔ اس کتاب میں ہر عنوان پر

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

قرآن و حدیث اور اقوالِ صحابہ و تابعین شامل ہیں۔ داتا گنج بخش اور شیخ شہاب الدین سہروردی نے کشف المحجوب اور عوارف المعارف میں متعدد جگہ آپ کے اقوال اور قوت القلوب کے حوالے دیے ہیں۔

3۔ کشف المحجوب، ابوالحسن علی بن عثمان جلابی ہجویری غزنوی المعروف بہ داتا گنج بخش(۱۰۰۹- ۱۰۷۲ء) کی روحانیت و تصوف کے موضوع پر لکھی ہوئی تصنیف ہے جو فارسی میں لکھی گئی۔ اس کے کئی تراجم دستیاب ہیں۔ شروع میں حضرت داتا گنج بخش کا قیام غزنی کے دو گاؤں ہجویر اور جلاب میں رہا، اس لیے ہجویری اور جلابی کہلائے۔ روحانی تعلیم جنیدیہ سلسلہ کے بزرگ ابوالفضل محمد بن الحسن ختلی رحمۃ اللہ علیہ سے پائی۔ مرشد کے حکم سے ۱۰۳۹ء میں لاہور پہنچے۔ لاہور میں بھاٹی دروازہ کے باہر آپ کا مزار مرجع خلائق ہے۔

4۔ آر اے نکلسن/ Reynold Alleyne Nicholson , (۱۸۶۸ء-۱۹۴۵ء) ممتاز مستشرق جو اسلامی ادب اور اسلامی تصوف دونوں کے عالم تھے، آپ کو انگریزی زبان میں وسیع پیمانے پر عظیم ترین رومی شناسوں اور مترجمین میں شمار کیا جاتا ہے۔ آپ نے کشف المحجوب کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا جو پہلی بار ۱۹۱۱ء میں گب میموریل لندن نے شائع کیا۔ ۱۹۳۶ء میں اس کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن شائع ہوا۔

5۔ لندن کا ایک اشاعتی ادارہ جو علوم و ادبیاتِ شرق سے متعلق کتب شائع کرتا تھا۔

6۔ شیخ فخر الدّین عراقی و کمیجانی (۱۲۸۹ء-۱۲۱۳ء) صوفی شاعر، عارف اور محقق ادیب تھے۔" لمعات" ان کی ایک صوفیانہ تصنیف ہے۔ لمعۃ کا مطلب ہے کرن اور چمک۔ لمعات کی تحریر کا انداز جامع، سادہ، فصیح، اور سعدی کی گلستان جیسا ہے، جس میں فارسی اور عربی اشعار، آیات اور احادیث کی آمیزش ہے۔

7۔ محی الدین محمد ابن العربی الحاتمی الطائی الاندلسی(۱۱۲۵ء-۱۲۴۰ء) ممتاز صوفی، عارف، محقق ہیں۔ اسلامی تصوف میں آپ کو شیخ اکبر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ تصوف اسلامی میں وحدت الوجود کا تصور سب سے پہلے انھوں نے ہی پیش کیا۔ بعض علما نے ان کے اس عقیدے کو الحاد و زندقہ سے تعبیر کیا ہے۔ مگر صوفیا انھیں شیخ الاکبر کہتے ہیں۔ ان کی تصانیف کی تعداد پانچ سو کے قریب ہے۔

"فتوحات مکیہ" ابن عربی کا سب سے ضخیم کام ہے جو پانچ سو ساٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ مکہ میں قیام کے دوران میں اس کتاب کی تحریر کا آغاز ہوا تھا اور اس کی بنیاد وہاں حاصل ہونے والے کشف تھے۔ یہ نہایت اہم تصنیف کا نام ہے جو آپ کی تحقیق کا نچوڑ تسلیم کی جاتی ہے۔ اس میں ہی وحدت الوجود پر بحث کی گئی ہے۔ یہ تصوف اسلامی پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والی کتاب ہے اور اس کا اثر تمام اسلامی صوفی سلسلوں میں پایا جاتا ہے۔ کئی نامور علما نے اس کی شرح کی ہے۔

8۔ شیخ محمود شبستری (۱۲۸۷ھ۔ ۱۳۲۰ھ) ایک عارف، ادیب اور شاعر ہیں۔ آپ اپنے وقت کے نامور علما فضلا اور متکلمین میں شمار ہوتے تھے۔ شاعری میں ان کی شہرت ''مثنوی گلشن راز'' پر ہے۔ یہ مثنوی ان ۱۵ یا ۱۷ سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے جو سید امیر الحسینی خراسانی نامی ایک عالم و صوفی نے آپ سے پوچھے تھے۔ اس کا انگریزی ترجمہ "The Mystic Rose Garden" کے عنوان سے ایڈورڈ ہنری نے ۱۸۸۰ء میں کیا۔

9۔ مولانا عبد الماجد دریابادی (۱۸۹۲ء۔۱۹۷۷ء) کو قصبہ دریاباد، ضلع بارہ بنکی (متحدہ صوبے، ہندوستان) کے ایک علمی گھرانہ "قدوائی خاندان" میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک محقق اور مفسر قرآن تھے۔ بہت سی ملی تنظیموں اور علمی، تحقیقی اور ادبی اداروں سے منسلک رہے۔ عبد الماجد دریابادی نے انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی ایک جامع تفسیر قرآن لکھی ہے۔

10۔ "فیہ مافیہ" یا مقالاتِ مولانا، مولانا جلال الدین محمد بلخی رومی کی نثری تصنیف ہے جو ۷۲ مقالات کی شکل میں ہے۔ جعفر مدرس صادقی کے مطابق فیہ مافیہ کا قدیمی قلمی مخطوطہ ۱۳۱۶ء کا دستیاب شدہ ہے جبکہ ایک دوسرا قلمی مخطوطہ اسرارِ جلیلہ کے نام سے دستیاب ہوا ہے جو ۱۳۵۰ء کا لکھا ہوا ہے۔ ۱۹۲۲ء میں مولانا عبد الماجد دریابادی کو "فیہ مافیہ" کا ایک نسخہ رام پور کے سرکاری کتب خانے سے دستیاب ہوا اور ۱۹۲۳ء میں نواب سالار جنگ کے کتب خانے سے مزید دو نسخے ملے۔ بعد ازاں پروفیسر نکلسن نے انھیں قسطنطنیہ میں موجود ایک نسخہ بھی مہیا کیا۔ مولانا صاحب نے اس کی تدوین کی اور یہ نسخہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ سے ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا۔ "فیہ مافیہ" کا انگریزی ترجمہ آرتھر جان اربری نے ۱۹۶۱ء میں کیا جو ۷۱ مقالات کی صورت میں شائع ہوا۔ ۱۹۹۸ء میں نئی دہلی سے دوبارہ انگریزی ترجمہ بنام Fiha Ma Fiha, Table Talk of Maulani Rumi شائع ہوا۔

11۔ مثنوی مولانا روم پر آراے نکلسن کا کام معیاری تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کی یہ کتاب ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۰ء تک آٹھ جلدوں میں شائع ہوئی۔ نکلسن نے مثنوی کے پہلے اہم فارسی ایڈیشن کو ڈھونڈا، انگریزی میں جتنا بھی کام رومی پر ہوا تھا، مکمل ترجمہ اور تشریح کے سلسلے میں نکلسن کا کام ان پر فوقیت رکھتا ہے۔ لہٰذا یہ کام دنیا بھر میں رومی تعلیمات کے میدان میں سب سے زیادہ مؤثر رہا۔

دوسرا خط

1۔ میر ولی اللہ ایبٹ آبادی (۱۸۸۷ء-۱۹۶۴ء) کریالہ ضلع جہلم میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والدِ گرامی ایبٹ آباد تشریف لے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کی۔ آپ ایک نامور وکیل، ایک سماجی شخصیت، شاعر، ادیب اور مترجم تھے۔ آپ کا شمار علامہ محمد اقبال کے رفقاء میں ہوتا ہے۔ آپ نے ۱۹۶۴ء عیسوی میں وفات پائی اور ایبٹ آباد میں دفن کیے گئے۔ آپ کا عظیم علمی کارنامہ ترجمہ و شرح دیوان حافظ ہے ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا۔

2۔ دیوانِ حافظ کا پنجابی ترجمہ ماسٹر غلام حیدر نے کیا۔

3۔ علامہ محمد اقبال پر رقم کی گئی پہلی انگریزی کتاب جس کے مولف ذوالفقار علی خان ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں شائع ہونے والی اس مختصر مگر اہم دستاویز میں اردو اور فارسی کلامِ اقبال کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ یہ تراجم اقبال کے دوست امراؤ سنگھ مجیٹھیا نے کیے۔

4۔ احمد دین نے اقبال کی اردو منظومات کے جائزے اور مقصدِ شاعری پر پہلی تنقیدی تصنیف "اقبال" کے عنوان سے رقم کی تھی جو ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی۔

5۔ مجلہ "نیرنگِ خیال" کا ستمبر اور اکتوبر ۱۹۳۲ء کا شمارہ اقبال نمبر شائع ہوا۔ اس وقت اس کے مدیران بدرالدین حسن اور حکیم محمد یوسف تھے۔ ۴۰۸ صفحات پر مشتمل اس شمارے میں اقبال کے بارے میں تنقیدی مضامین کے علاوہ منظوم حرفِ تحسین بھی پیش کیا گیا ہے۔

6۔رابندر ناتھ ٹیگور نے ایرانی حکومت کی دعوت پر ۱۹۳۲ء میں ایران کا دورہ کیا۔قدیم ایران،زرتشتی مذہب میں اس کی دلچسپی،اس کے ادب کی تعریف اور اسلام اور ہندومت میں مشترک بنیاد تلاش کرنے کی خواہش کے پیش نظر،اس نے رضا شاہ کی جانب سے ایران آنے کی دعوت قبول کی۔ان کے ساتھ بنگالی دانشوروں کا ایک چھوٹا سا وفد بھی تھا،جن میں امیہ کمار چکرورتی اور کیدار ناتھ چٹوپادھیائے بھی شامل تھے۔ٹیگور نے اپنے ایران کے سفر کے بارے میں بنگالی میں ایک سفر نامہ بھی رقم کیا۔

7۔یونان کی آزادی کی جنگ(۱۸۲۱ء تا ۱۸۲۹ء)کے دوران میں ۱۸۲۷ء میں برطانیہ،فرانس اور روس کی اتحادی افواج نے مصر اور ترک افواج کو شکست دی۔یہ تاریخ کی آخری بحری جنگ تھی جو مکمل طور پر بحری جہازوں سے لڑی گئی۔

8۔دریائے دجلہ اور دریائے فرات کے درمیان واقع علاقے کو میسوپوٹیمیا(Mesopotamia)کہتے ہیں،جہاں دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں مثلاً عکادی،اشوری اور بابل نے جنم لیا۔یہ چھ ہزار سال قبل مسیح سے بھی زیادہ پرانی ہے۔یہ بین النہرین کا علاقہ کہلاتا ہے۔عربی میں مابین النھرین کہلاتا ہے۔ٹیگور نے ۱۹۳۲ء میں دورہ ایران کے ساتھ اس علاقے کا بھی دورہ کیا۔

تیسرا خط

1۔گستاسپ شا کیخسرو نریمان(۱۸۷۳ء–۱۹۳۳ء)ایک پارسی صحافی اور ادیب تھے۔وہ سنسکرت اور فارسی کے ماہر تھے۔انھوں نے ایران کی تہذیب و ثقافت پر متعدد تصانیف رقم کیں اور ایران پر اسلامی اثرات کے بہت مداح تھے۔۔گستاسپ شا کیخسرو نریمان کا علامہ محمد اقبال کے نام مرقومہ خط بتاریخ ۱۱جولائی ۱۹۳۲ء(اس خط کا متن آخر میں مہیا کیا جارہا ہے)

2۔"دی بمبے کرانیکل"The Bombay Chronicle"بمبئی سے شائع ہوتا تھا،جس کا آغاز ۱۹۱۰ء میں سر فیروز شاہ مہتا (۱۸۴۵ء–۱۹۱۵ء)نے کیا تھا،جو ایک ممتاز وکیل تھے۔۱۸۹۰ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے صدر بنے۔"دی بمبے کرانیکل"اپنے وقت کا ایک اہم قوم پرست اخبار تھا،اور ایک غیر مستحکم قبل از آزاد ہندوستان کی سیاسی ہلچل کا ایک اہم مورخ تھا۔یہ اخبار ۱۹۵۹ء میں بند ہو گیا۔

3۔اقبال مختلف جامعات کے لیے بہ طور ممتحن فرائض انجام دیتے رہے۔وہ پنجاب یونیورسٹی کے مختلف تعلیمی درجوں کے لیے فارسی،فلسفہ اور عربی کے ممتحن رہے۔محمد حنیف شاہد کے مطابق ایم اے فارسی کے دوسرے پرچے کے ممتحن تھے۔

4۔مجلہ"ایرانشہر"جرمنی کے شہر برلن سے ۱۹۲۲ء۔۱۹۲۷ء حسین کاظم زادہ کے زیر ادارت شائع ہوتا تھا۔

5۔مجلہ"کسریٰ"تہران سے شائع ہونے والا کثیر الجہت اخبار تھا۔اس کے بانی حسین زعیمی تھے جن کا شمار حکومت مخالف صحافیوں میں ہوتا تھا۔

6۔امان اللہ خان(۱۸۹۲ء– ۱۹۶۰ء)اپنے والد امیر حبیب اللہ خان کے قتل کے بعد ۱۹۱۹ء میں کابل میں تخت پر بیٹھے۔چند ماہ بعد افغانستان کی تیسری جنگ چھڑ گئی۔اس جنگ میں برطانوی افواج تین محاذوں پر مغلوب ہوئیں مگر معاہدہ راولپنڈی کی رو سے برطانیہ نے افغانستان کی مکمل خود مختاری قبول کی اور دونوں حکومتوں میں مساوی درجے پر تعلقات قائم ہو گئے۔

امان اللہ خان نے افغانستان میں مغربی طرز کا نظم و نسق قائم کرنے کی کوشش کی۔۱۹۲۸ء میں ملکہ ثریا کے ہمراہ یورپ کا سفر کیا اور سوویت روس بھی گئے۔وہاں کے سماجی انقلاب سے بہت متاثر ہوئے اور افغانستان میں سماجی اصلاحات کیں۔

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

چوتھا خط

1۔ سید حسن تقی زادہ (۱۸۷۸-۱۹۷۰) ایک بااثر ایرانی سیاست دان اور سفارت کار تھے۔ وہ ایک ممتاز عالم بھی تھے۔ ایرانی کیلنڈرز پر ان کی تحقیق اب تک حوالہ جاتی ہے۔ وہ ایک روایتی اسلامی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد، سید تقی، ایک مذہبی رہنما تھے لیکن سید حسن تقی زادہ نے اوائل عمری سے ہی روشن خیال نظریات اور آئین پرستی کے مغربی تصور میں دلچسپی ظاہر کی۔

جدید سیاسی تاریخ میں تقی زادہ کو ایک سیکولر سیاست دان کے طور پر جانا جاتا ہے، جن کا خیال تھا کہ "ظاہری اور باطنی طور پر، جسم اور روح میں ایران کو یورپی ہونا چاہیے" وہ روس اور خاص طور پر مغربی یورپ سے آنے والے جدید اور ترقی پسند خیالات کا گیٹ وے خیال کیے جاتے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم، دوسری جنگ عظیم اور اس کے بعد تقی زادہ ایران کے سب سے بااثر شخص تھے جنھوں نے روس اور برطانیہ کے خلاف جرمنی کے مفادات کی حمایت کی۔

مکتوبِ اقبال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سید حسن تقی زادہ کو اچھی طرح جانتے ہیں لیکن وہ ان سے کس طرح متعارف تھے، اس کے شواہد دستیاب نہیں۔

مکتوب جی۔کے۔ نریمان بنام علامہ محمد اقبال

1۔ رضا شاہ (۱۸۷۸ء۔۱۹۴۴ء) کا اصل نام رضا خان تھا۔ وہ ایک سپاہی کے بیٹے تھے۔ معمولی تعلیم حاصل کی۔ نوجوانی میں فوج میں بھرتی ہو گئے اور جلد ہی اعلیٰ عہدے پر فائز ہو گئے۔ ۱۹۲۱ء میں حکومت کا تختہ الٹ دیا اور ۱۹۲۳ء میں وزیر اعظم کا عہدہ خود سنبھال لیا۔ انھوں نے فارس کو ایران کا نام دیا۔

۱۹۲۵ء میں قاجار خاندان کے آخری بادشاہ احمد شاہ قاجار کو معزول کر کے خود بادشاہ بن گئے اور رضا شاہ پہلوی کا لقب اختیار کیا۔ انھوں نے فوج اور ملکی نظم و نسق میں اصلاحات کیں، بیرونی ممالک کی مراعات منسوخ کر دیں اور ایران کو خارجی اثر و رسوخ سے پاک کر دیا۔ ان کے عہد میں ٹرانس ایرانین ریلوے کا اجرا ہوا اور دانش گاہِ تہران قائم ہوئی۔

دوسری عالمی جنگ میں ایران نے جرمنی کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھے۔ اس پر برطانوی اور روسی افواج ایران میں داخل ہو گئیں۔ انگریزوں نے رضا شاہ کو تخت چھوڑنے اور اپنے بیٹے محمد رضا شاہ پہلوی کو حکومت سونپنے پر مجبور کیا۔ ۱۹۴۱ء میں رضا شاہ جنوبی افریقہ چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔

2۔ سُدرہ وہ سفید چغہ ہے جو زرتشتی مذہب کے پیروکار پہنتے ہیں اور کُستی کمر بند کو کہا جاتا ہے۔

3- عبدالرحمن سیف آزاد (۱۸۸۴ء-۱۹۷۱ء) ایرانی صحافی اور پبلشر تھے۔ وہ اخبار "ایران باستان" کے ناشر تھے، جو ایران کے مشہور اخبارات میں سے ایک ہے۔ برلن میں انھوں نے "شرقی" کے نام سے ایک پرنٹنگ ہاؤس قائم کیا۔ اس کے علاوہ، جرمنی میں اپنے بارہ سالہ قیام کے دوران، انھوں نے آزادی شرق کے نام سے اخبار اور رسالے "ایران نو" کے علاوہ ایرانی اور جرمن خواتین کے لیے صنعتی گائیڈ شائع کیے، جو کثیر لسانی تھے۔

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

تہران واپس آنے کے بعد، ایران اخبار "ایران باستان" کا اجرا کیا، جسے پریس کے کام میں جدت پسندی کی وجہ سے بے مثال پذیرائی ملی۔ انھوں نے ہندوستان میں بھی ایک پرنٹنگ ہاؤس قائم کیا۔ دوسری جنگ عظیم کے آغاز اور پولینڈ پر جرمنی کے حملے کے بعد برطانوی سیکورٹی ایجنٹوں نے انہیں کسی وجہ سے گرفتار کر لیا اور جنگ کے اختتام تک جیل میں رکھا۔

4۔ محمد علی فروغی (۱۸۷۷ء-۱۹۴۲ء) تہران میں اصفہان کے ایک تاجر گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباواجداد، مرزا ابوتراب، نادر شاہ افشار کی تاجپوشی کے دوران میدانِ موگن میں اصفہان کے نمائندہ تھے۔۱۹۰۷ء میں والد کے انتقال کے بعد ذکاء الملک کا خطاب وراثت میں ملا۔ اسی سال کے دوران، فروغی تہران سکول آف پولیٹیکل سائنس کے ڈین بن گئے۔

۱۹۰۹ء میں، وہ تہران کی نمائندگی کرتے ہوئے مجلس (پارلیمنٹ) کے رکن کے طور پر سیاست میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد وہ ایوان کے اسپیکر اور بعد میں کابینہ میں وزیر کے ساتھ ساتھ تین بار وزیر اعظم اور ایک بار قائم مقام وزیر اعظم بنے۔ ۱۹۱۲ء میں وہ ایرانی سپریم کورٹ کے صدر بنے۔ بعد میں انھیں وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ وہ ۱۹۳۵ء میں برطرف کر دیے گئے لیکن محمد رضا شاہ پہلوی کے دور حکومت کے ابتدائی دور میں وزیر اعظم بن گئے۔ ۱۹۴۱ء میں انھیں امریکہ میں ایران کا سفیر نامزد کیا گیا، لیکن وہ عہدہ سنبھالنے سے پہلے ہی ۶۷ سال کی عمر میں تہران میں انتقال کر گئے۔

فلسفے میں فروغی کی سب سے اہم تصنیف "سیر حکمت در اروپا" (یورپ میں فلسفہ کا ارتقا) ہے، جس میں ساتویں صدی قبل مسیح میں یونان کے سات داناؤں سے لے کر ہنری برگساں تک یورپی فلاسفروں کے افکار کا احاطہ کیا گیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اقبال بنام آرام، پہلا خط: ۲۰ جون ۱۹۳۲ء
۲۔ اقبال بنام آرام، پہلا خط: ۲۰ جون ۱۹۳۲ء
۳۔ اقبال بنام آرام، دوسرا خط: ۲۰ جون ۱۹۳۲ء
۴۔ اقبال، کلیاتِ اقبال (اردو)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۳ء (بارھویں اشاعت)، ص ۳۰۶
۵۔ ایضاً، ص ۲۸۵
۶۔ ایضاً، ص ۳۸۳
۷۔ اقبال بنام آرام، دوسرا خط: ۲۷ جون ۱۹۳۲ء
۸۔ اقبال، کلیاتِ اقبال (فارسی)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۳ء (بارھویں اشاعت)، ص ۳۰۶
۹۔ اقبال، شذراتِ فکرِ اقبال، مرتبہ: ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال (مترجمہ: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی)، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۱۰۱
۱۰۔ اقبال بنام آرام، تیسرا خط، ۶ جولائی ۱۹۳۲ء
۱۱۔ اقبال بنام آرام، تیسرا خط، ۶ جولائی ۱۹۳۲ء
۱۲۔ اقبال بنام آرام، تیسرا خط، ۶ جولائی ۱۹۳۲ء

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلہ
دریافت

۱۳۔اقبال بنام آرام، تیسرا خط، ۶ جولائی ۱۹۳۲ء
۱۴۔اقبال بنام آرام، تیسرا خط، ۶ جولائی ۱۹۳۲ء
۱۵۔اقبال بنام آرام، تیسرا خط، ۶ جولائی ۱۹۳۲ء

References in Roman Script:

1. Iqbal Banam Aram, Pehla Khat: 20 June 1932
2. Iqbal Banam Aram, Pehla Khat: 20 June 1932
3. Iqbal Banam Aram, Dosra Khat: 20 June 1932
4. Iqbal, Kulliyat-e-Iqbal (Urdu), Iqbal Academy Pakistan, Lahore, 2013 (Barhwin Ashaat), P. 306
5. Ibid, P. 285
6. Ibid,P. 383
7. Iqbal Banam Aram, Dosra Khat: 27 June 1932
8. Iqbal, Kulliyat-e-Iqbal (Farsi), Iqbal Academy Pakistan, Lahore, 2013 (Barhwin Ashaat), P.306
9. Iqbal, Shazrat-e-Fikr-e-Iqbal, Murattaba: Dr. Justice Javed Iqbal (Mutarjama: Dr. Iftikhar Ahmed Siddiqui), Majlis Taraqqi Adab, Lahore, 1983, P.101
10. Iqbal Banam Aram, Teesra Khat, 6 July 1932
11. Iqbal Banam Aram, Teesra Khat, 6 July 1932
12. Iqbal Banam Aram, Teesra Khat, 6 July 1932
13. Iqbal Banam Aram, Teesra Khat, 6 July 1932
14. Iqbal Banam Aram, Teesra Khat, 6 July 1932
15. Iqbal Banam Aram, Teesra Khat, 6 July 1932

Dr. Tariq Mahmood is an Associate Professor in the Department of Urdu at GC University, Faisalabad, Pakistan. He holds a Ph.D. in Urdu from Peshawar University, where he specialized in Poetry and Criticism. Dr. Mahmood has contributed extensively to the field, publishing 90 research articles and authoring 30 books. His scholarly interests include modern literary criticism and the poetic traditions of Urdu literature. In addition to his academic role, he is currently serving as the Principal of the College of Oriental Languages at GC University, Faisalabad.

Dr. Ali Bayat is a distinguished Faulty Member in the Department of Urdu at the University of Tehran, Iran. Holding a Ph.D. in Urdu from Punjab University, Pakistan, focusing on Poetry and Linguistics. Dr. Bayat has made substantial contributions to Urdu literature, with 35 articles published in renowned Journals and 05 books, highlighting his expertise and dedication to advancing the study and appreciation of Classical Urdu poetry and contemporary linguistic analysis.

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلہ دریافت

Received: 11th Aug, 2024 | Accepted: 15th Dec, 2024 | Available Online: 31st Dec, 2024
Digital Object Identifier: 10.52015/daryaft.v16i02.403

تاریخی ڈراموں کے تناظر میں برصغیر پاک وہند کی ثقافت پر ترک ڈرامے "کرولوش عثمان" کے اثرات کا مطالعہ

An Academic Study on Impact of the Turkish Drama "Kurulus Osman" on the Culture of the Indian Subcontinent in the Context of Historical Dramas

DR. MUHSİN RAMAZAN İŞSEVER[1] AND ZEYNEP ALTINKÖPRÜ[2]
[1] Research Associate, Department of Urdu, Istanbul University, Türkiye
[2] Research Scholar Ph.D. Department of Urdu, Istanbul University, Türkiye
Corresponding Author: Dr. Muhsin Ramzan Issever (muhsinissever89@gmail.com)

ABSTRACT Television and other mass media play a significant role in history education. Visual and auditory content makes historical events more comprehensible, while educational programs, documentaries, films, and series provide in-depth information. In this context, the United States has been successful in transmitting its cultural history to different nations through popular culture sources. While educational programs offer systematic knowledge, documentaries provide detailed information by covering real events and people. Cinema uses dramatic storytelling techniques to bring historical events to a broad audience and help viewers form an emotional connection. Series, on the other hand, offer a detailed and comprehensive narrative by addressing historical events and figures from a broader perspective. This study examines the impact of the Turkish series "Kurulus Osman" on the culture of the Indian subcontinent. "Kurulus Osman" provides viewers with a historical perspective by dramatically portraying the founding period of the Ottoman Empire. The reception of the series in the Indian subcontinent, its audience, and popularity on social media have been researched. Additionally, the series' impact on Indian culture, including whether it has increased interest in historical events, has been analyzed with statistical data. The series' effects have been assessed within the framework of media and cultural impact theories, and academic sources have been cited on the role of cultural transmission in history education. The importance of the series in terms of history education and cultural interaction has been highlighted.

Keywords: Media and Cultural Impact, Historical Series, Indian Subcontinent Culture, Turkish Culture, Kurulus Osman

ٹیلی ویژن اور دیگر ذرائع ابلاغ تاریخ کی تعلیم میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ بصری اور سمعی مواد فراہم کر کے تاریخی واقعات کو زیادہ قابل فہم بناتے ہیں، تعلیمی پروگراموں اور دستاویزی فلموں، سینما اور ڈراموں کے ذریعے گہرائی سے معلومات فراہم کرتے ہیں۔ امریکہ نے اپنی ثقافتی تاریخ کو فلموں، موسیقی، ٹی وی، رسائل، فیشن، کھیلوں کی تقریبات جیسے مقبول ثقافتی ذرائع استعمال کر کے مختلف قوموں کی میڈیا یا ذرائع ابلاغ کے غلط استعمال کے واقعات بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ دنیا بھر میں اکثر تفریح کے لیے استعمال

This work is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

ہوتے ہیں اور وقت گزارنے کا ایک ذریعہ بن چکے ہیں۔ لہٰذا، انسانی زندگی کے لئے اہم دوسرے مشاغل کی جگہ بھی لے لی ہے، اور لوگوں کو ان کی زندگی کے مقصد سے بھی دور کر دیا ہے۔[۲] آجکل، ذرائع ابلاغ معاشرتی ثقافت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا ناممکن ہو گیا ہے کہ نئی نسل کی ثقافت ذرائع ابلاغ سے آزاد ہے۔ سوشل میڈیا پلیٹ فارم ثقافتی معیارات، اقدار اور رویوں کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

تعلیمی پروگرام، عام طور پر ایک مخصوص نصاب کے تحت تیار کیے جاتے ہیں اور ناظرین کو منظم اور مرتب شدہ سائنسی معلومات فراہم کرنے کا مقصد رکھتے ہیں۔ دستاویزی فلمیں، حقیقی واقعات اور شخصیات کو موضوع بناتے ہوئے، ناظرین کو گہرائی میں جا کر تحقیق پر مبنی معلومات فراہم کرتی ہیں۔ سینما، ڈرامائی اور فنکارانہ بیان کے طریقے استعمال کر کے تاریخی واقعات کو وسیع پیمانے پر پہنچاتا ہے اور ناظرین کو جذباتی طور پر منسلک ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ ڈرامے، بھی ڈرامائی عناصر اور تخیلاتی کہانیوں کے ساتھ تاریخی واقعات اور شخصیات کو زندہ کرتے ہیں اور یہ ایک سے زیادہ اقساط پر مشتمل ہوتے ہیں جو عام طور پر کئی سیزن تک چلتے ہیں۔ ڈرامے، تاریخی واقعات اور شخصیات کو سینما سے زیادہ وسیع نقطہ نظر سے پیش کرتے ہیں اور ناظرین کو زیادہ تفصیلی اور جامع بیان فراہم کرتے ہیں۔ اگرچہ تاریخی سینما اور ڈرامے اپنے موضوعات کو حقیقی واقعات اور شخصیات سے اخذ کرتے ہیں، مگر ناظرین کو متوجہ رکھنے کے خواہاں ہونے کے باعث بعض اوقات حقیقت سے دور ہو کر فنکارانہ آزادی کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ تمام ذرائع، ثقافتی اور معاشرتی پس منظر کو مد نظر رکھتے ہوئے، ناظرین کو تاریخی واقعات کو زیادہ وسیع نقطہ نظر سے سمجھنے میں مدد فراہم کرتے ہیں۔

تاریخی ڈرامے اور دستاویزی فلمیں، ناظرین کو ماضی میں پیش آنے والے واقعات کو ڈرامائی انداز میں پیش کر کے، تاریخی معلومات کو زیادہ آسانی سے سمجھنے اور یاد رکھنے میں مدد کرتی ہیں۔ نیز، یہ ماضی کے واقعات اور موجودہ دور کے درمیان تعلقات کو بھی اجاگر کرتی ہیں۔ تاریخی ڈرامے ناظرین کو صرف تفریح ہی فراہم نہیں کرتے، بلکہ ثقافتی اور تاریخی معلومات کی منتقلی میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس تناظر میں، ترک ڈرامہ " کرولوش عثمان " بھی عثمانی ریاست کے قیام کے دور کو ڈرامائی طور پر پیش کرتے ہوئے ناظرین کو تاریخی تناظر فراہم کرتا ہے۔

ٹیلیویژن نشریات، ۱۹۰۰ کی دہائی کے پہلے چوتھائی میں عالمی سطح پر شروع ہوئیں، تاہم ٹیلیویژن کے پیچیدہ ڈھانچے اور زیادہ لاگتوں کی وجہ سے مختلف ممالک میں مختلف وقتوں پر ترقی ہوئی۔ ترکی میں ٹیلیویژن کا آغاز، امریکہ اور انگلینڈ کے بعد، ۱۹۵۲ میں استنبول ٹیکنیکل یونیورسٹی (İTÜ) میں ہوا۔ مصطفیٰ سانتور کی قیادت میں شروع ہونے والے یہ منصوبے تکنیکی اور اقتصادی مشکلات کی وجہ سے محدود رہے۔ ترکی میں پہلی تجرباتی نشریات ۱۹۵۲ میں İTÜ میں منعقد ہوئیں، تاہم یہ نشریات صرف فیکلٹی بلڈنگ میں اور ہفتے میں دو گھنٹے ہو سکتی تھیں۔ ۱۹۶۸ میں TRT کے قیام کے بعد، ٹیلیویژن نشریات وسیع تر عوام تک پہنچنے لگیں اور ۱۹۷۱ میں تمام نشری حقوق TRT کو منتقل ہو گئے۔ رنگین ٹیلیویژن نشریات ۱۹۸۱ میں شروع ہوئیں اور ۱۹۸۴ میں مکمل طور پر رنگین نشریات کا آغاز ہوا۔ آئین کے آرٹیکل ۱۳۳ میں تبدیلی کے ساتھ، نجی ٹیلیویژن قانونی حیثیت اختیار کر گئے اور ریڈیو ٹیلیویژن سپریم کونسل (RTÜK) قائم ہوئی۔ ۱۹۰۰ کی دہائی میں نجی ٹیلیویژن نشریات کا آغاز ہوا۔ ترکی میں ٹیلیویژن نشریات، اقتصادی اور سیاسی مشکلات کی وجہ سے تاخیر کا شکار

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

ہوئیں، تاہم سیٹلائٹ نشریات کی منتقلی کے ساتھ وسیع تر علاقوں تک پہنچیں۔ [۳] ترکی میں ٹیلیویژن نشریات، تکنیکی اور اقتصادی مشکلات، سیاسی مداخلتوں اور قانونی ضوابط کی وجہ سے تاخیر کا شکار ہوئیں، تاہم وقت کے ساتھ ساتھ عوامی اور نجی شعبے کی شراکت سے اہم پیشرفتیں کی گئیں۔ڈرامہ انڈسٹری بھی ان ترقیات سے متاثر ہوئی اور بین الاقوامی سطح پر بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔

ہم اپنے اس مطالعے میں" کرولوش عثمان " ڈرامے کے برصغیر پاک وہند سامعین پر اثرات کا جائزہ لیں گے۔ ہماری تحقیق میں، "کرولوش عثمان " ڈرامے کے سب سے زیادہ سبسکرائبرز والے اردوزبان کے آفیشل یوٹیوب چینل "Kurulus Osman Urdu by atv" پر موجود ناظرین کے تبصروں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ان تبصروں کا استعمال ڈرامے کو برصغیر پاک وہند سامعین کے ذریعے کس طرح سمجھا جارہا ہے اور کون سے موضوعات نمایاں ہورہے ہیں، یہ جاننے کے مقصد کے تحت کیا گیا ہے۔

برصغیر پاک وہند کے ذرائع ابلاغ، سیٹلائٹ نشریات اور انٹرنیٹ کے ذریعے غیر ملکی ثقافتوں کے پھیلاؤ میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔نوجوانوں میں اخلاقی اقدار، معیارات اور طرز زندگی پر اس کا بہت بڑا اثر ہے۔خاص طور پر ترک ڈرامے بڑی مقبولیت حاصل کر رہے ہیں۔یہ ڈرامے، دلکش ثقافتی عکاسی، عالیشان طرز زندگی اور مہنگی گاڑیوں کے ذریعے ناظرین کی توجہ حاصل کر رہے ہیں۔ٹیلی ویژن دیکھنے کی عادتیں،لوگوں کے مختلف موضوعات پر خیالات اور فہم کو تشکیل دے رہی ہیں۔عالمی اثرات اور میڈیا کے اثرات کی وجہ سے، ثقافتی تبدیلیاں ہورہی ہیں اور مقامی شناختیں پیچیدہ ہورہی ہیں۔ترک ڈراموں کاprime-time میں نشر ہونا ان کی برصغیر پاک و ہند میں قبولیت کا ایک ثبوت ہے۔یہ ڈرامے، ثقافتی اقدار اور مقامی پروڈکشن پر براہ راست اثر انداز ہو رہے ہیں۔ ثقافت، ہر قوم کو دوسری قوموں سے ممتاز اور منفرد بناتی ہے اور زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتی ہے۔[۴] برصغیر پاک وہند، اپنی متنوع ثقافتی ورثے کے لیے جانا جاتا ہے۔ نتیجتاً، ترک ڈراموں کی مقبولیت، برصغیر پاک وہند کی ثقافتی شناخت اور مقامی ڈرامہ انڈسٹری پر گہرے اثرات ڈال رہی ہے۔ان میں سے بعض تخلیقات، اسلام اور اخلاقی زندگی کے حوالے سے بہترین مثالیں پیش کر کے معاشرے پر مثبت اثرات مرتب کرتی ہیں جبکہ کچھ منفی اثرات بھی چھوڑ سکتی ہیں۔"کرولوش عثمان" ڈرامہ عمومی طور پر معاشرے پر مثبت اثر ڈالنے والے ڈرامے کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔

اس تحقیق میں، ۲۰۲۱ سے ۲۰۲۴ تک" کرولوش عثمان "ڈرامے کے سب سے زیادہ سبسکرائبرز والے اردو زبان کے آفیشل یوٹیوب چینل "Kurulus Osman Urdu by atv" پر موجود ہزاروں تبصروں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔تجزیہ کیے گئے تبصروں کے ذریعے بنیادی موضوعات اور تصورات کی نشاندہی کی گئی اور ان موضوعات پر ایک تجزیہ کیا گیا۔ تبصروں کے درمیان اکثر نمایاں ہونے والے موضوعات میں مذہبی اور روحانی محرکات، تاریخی عناصر اور اخلاقی اقدار جیسے عناصر شامل ہیں۔صرف یوٹیوب کے تبصروں کی جانچ پڑتال کے باعث یہ تحقیق محدود ناظرین کے حلقے پر مرکوز ہے۔ہماری تحقیق میں دیگر سوشل میڈیا چینلز اور ٹیلی ویژن چینلز جیسے عوامی ذرائع کا جائزہ نہیں لیا گیا، جس کی وجہ سے حاصل شدہ نتائج کی عامیت محدود ہے۔

atv چینل پر نشر ہونے والا" کرولوش عثمان"ڈرامہ،TRT پر نشر ہونے والے "دریلیش ارطغرل"ڈرامے کا تسلسل ہے، جو ترکی کے بجائے دنیا کے دیگر ممالک، خاص طور پر برصغیر پاک وہند میں ناظرین کی ریکارڈ توڑ دلچسپی کا مرکز بنا ہوا ہے۔" کرولوش عثمان"

ڈرامہ، "دریلیش ارطغرل" کے آخری قسط کے نشر ہونے کے چھ ماہ سے بھی کم وقت بعد، ۲۰ نومبر ۲۰۱۹ کو اپنی پہلی قسط کے ساتھ نشر ہو۔[۵] یہ ڈرامہ، عثمانی سلطنت کے قیام کے عمل اور عثمان صاحب کی زندگی پر مبنی ہے۔ "کرولوش عثمان" ڈرامہ، تاریخی واقعات کو ڈرامائی انداز میں پیش کر کے ناظرین کو پیش کرتا ہے اور وسیع ناظرین کے حلقے کے ذریعے دلچسپی سے دیکھا جاتا ہے۔ اس ڈرامے کے پروڈیوسر محمد بوزداغ ہیں اور مرکزی کردار میں براق اوزچیوٹ ہیں۔ "کرولوش عثمان" نے نہ صرف ترکی میں بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی زبردست پذیرائی حاصل کی ہے اور متعدد ایوارڈز بھی جیتے ہیں.

عثمان صاحب: ڈرامے کا مرکزی کردار اور سلطنت عثمانیہ کا بانی۔ براق اوزچیوٹ کی طرف سے پیش کیا گیا ہے۔

بالا خاتون: عثمان صاحب کی بیوی، اوزگے ٹورر کی طرف سے پیش کی گئی ہے۔

مالھون خاتون: عثمان صاحب کی دوسری بیوی، یلدز چاغری اٹلکسوے کی طرف سے پیش کی گئی ہے۔

دوندار صاحب: عثمان بیگ کے چچا، راغب ساواش کی طرف سے پیش کیا گیا ہے۔

شیخ ادیبالی: عثمان صاحب کے روحانی رہنما، صدا یلدز کی طرف سے پیش کیا گیا ہے۔

یوٹیوب پلیٹ فارم آج کے دور میں ڈرامے دیکھنے اور ناظرین کے تعامل کے لئے ایک اہم پلیٹ فارم بن چکا ہے۔ ناظرین صرف اس پلیٹ فارم پر موجود مواد کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ، تبصرے اور تعامل کے ذریعے اپنے تجربات بھی شیئر کر سکتے ہیں۔ یہ تبصرے ناظرین کے دیکھے ہوئے ڈراموں کو کس طرح سمجھا جاتا ہے، اس کے لئے ایک اہم ڈیٹا ذریعہ فراہم کرتے ہیں۔ لہٰذا، یوٹیوب پلیٹ فارم کا یہ تعاملاتی ماحول نہ صرف ڈرامے کی کامیابی بلکہ ناظرین کی متحرکات کا بہتر طور پر تجزیہ کرنے کا موقع بھی فراہم کرتا ہے۔

"کرولوش عثمان" ڈرامہ، ترکی کی ٹیلیویژن تاریخ کے سب سے زیادہ توجہ پانے والے پروڈکشنز میں سے ایک ہے، جس نے صرف ترکی میں نہیں بلکہ دنیا بھر میں وسیع ناظرین کے حلقے تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ یہ ڈرامہ، عثمانی تاریخ اور خصوصاً اس کے قیام کے دور کی کہانی بیان کرنے والے "دریلیش ارطغرل" کا تسلسل ہے۔ "کرولوش عثمان" ڈرامہ خاص طور پر برصغیر پاک وہند کے ناظرین کے درمیان بڑے پیمانے پر پسند کیا جاتا ہے۔ "دریلیش ارطغرل" ڈرامہ عمومی طور پر ارطغرل کے کردار کو زمین اور وطن کے حصول، اس کے فوجی اور جنگجو کی حیثیت سے بیان کرتا ہے، جو انفرادی کہانی سے زیادہ ایک اوغوز قبیلے کی بحالی اور قوم بننے کے سفر کی کہانی پیش کرتا ہے۔ جبکہ "کرولوش عثمان" ڈرامے میں زیادہ تر عثمان کی انفرادی کامیابیوں کو دکھایا جاتا ہے؛ عثمانی سلطنت کے قیام کی کہانی کو اس کے بہادری، سرکشی اور چیلنج کرنے والے کردار کے ساتھ ملا کر پیش کیا جاتا ہے۔"[۶] "کرولوش عثمان" ڈرامے کے نشریاتی حقوق رکھنے والے ترک زبان کے آفیشل یوٹیوب چینل اور اردو زبان کے آفیشل یوٹیوب چینل کے ناظرین اور ویوز کی تعداد کا موازنہ کیا جائے تو برصغیر پاک وہند میں ڈرامے کی کامیابی واضح ہوتی ہے۔ ڈرامے کے نشریاتی حقوق رکھنے والے سب سے زیادہ سبسکرائبرز والے "Kurulus Osman Urdu by atv" یوٹیوب چینل پر موجود تبصروں کا تجزیہ، برصغیر پاک وہند میں اردو بولنے والے ناظرین کے ڈرامے کو پسند کرنے کی وجوہات میں سب سے نمایاں اسلامی اور روحانی موضوعات کے اُبھرنے کو ظاہر کرتا ہے۔ اس تناظر میں، اردو بولنے والے ناظرین کی ڈرامے کو دیکھنے کی ترغیب خاص طور پر مذہبی اور روحانی موضوعات سے ہوتی ہے۔ بہت سے ناظرین نے بیان کیا

کہ ڈرامے کے اسلامی اقدار، شہادت، جہاد، ایمان اور اسلام کے تاریخی عمل کو بیان کرنے والے عناصر ان کے لیے روحانی اہمیت رکھتے ہیں۔ناظرین کے ایک اہم حصے نے یہ اظہار کیا ہے کہ "کرولوش عثمان" ڈرامہ دیکھنے کے دوران ان کے ایمان کی تجدید ہوتی ہے اور اسلام کے ساتھ ان کی وابستگی مضبوط ہوتی ہے۔ یہ حقیقت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ ڈرامہ ایک طرح کی روحانی رہنمائی فراہم کرتا ہے اور ناظرین کی روحانی اور مذہبی اعتبار سے مطمئن ہونے کی خواہش کو پورا کرتا ہے۔"کرولوش عثمان"ڈرامہ، اسلام کی تاریخ کے اہم شخصیات، سلطنت عثمانیہ کے قیام اور اس دوران پیش آنے والے مشکلات کو اجاگر کرتے ہوئے ناظرین کو اسلام کے بنیادی اصول، بہادری اور قربانی جیسے اقدار کی یاد دہانی کرواتا ہے۔ناظرین کے تبصروں کا تجزیہ ظاہر کرتا ہے کہ ان موضوعات کی نمائش ناظرین کی مذہبی وابستگی کو تقویت دیتی ہے اور اسلام پر ان کے عقیدے کو مستحکم کرتی ہے۔ کئی ناظرین نے یہ بھی بیان کیا کہ ڈرامہ دیکھنے سے ان کا ایمان "دوبارہ زندہ ہو گیا" اور "زیادہ گہری مذہبی وابستگی محسوس کی"۔

"کرولوش عثمان" ڈرامہ خصوصاً اسلامی موضوعات کے لحاظ سے ناظرین کے درمیان پسند کیے جانے کی اہم وجوہات میں شامل ہے۔شہادت، جہاد اور اللہ کی تسلیمیت جیسے موضوعات کو بار بار نمایاں کیا گیاہے۔"کرولوش عثمان"ڈرامے میں کردار ان نظریات کے مطابق جدوجہد کرتے ہیں۔ناظرین نے بیان کیا ہے کہ وہ ماضی کے مسلمانوں کی بہادری اور ان کی دی ہوئی قربانیوں کو دیکھ کر ان اقدار کو اپنی زندگیوں میں نمونہ بناتے ہیں۔ڈرامے میں بار بار پیش کیے جانے والے شہادت اور اللہ پر اعتماد کے موضوعات ناظرین کے دینی شعور کو بڑھا کر انہیں روحانی تحریک کا ذریعہ بنتے ہیں۔ بہت سے ناظرین نے کہا ہے کہ انہوں نے ڈرامہ دیکھ کر "شہید ہونے کا مطلب" بہتر طور پر سمجھا ہے اور پہلے جو خوف محسوس ہوتا تھا، وہ اب بہادری میں بدل چکا ہے۔ تجزیہ کیے گئے ہزاروں تبصروں میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اسلام کے نام پر شہید ہونے والوں کی یاددہانی اور دلوں میں اسلامی جوش وخروش کو بڑھانے کے باعث ڈرامے کی دلچسپی میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔

"کرولوش عثمان" ڈرامے کے برصغیر پاک وہند میں ناظرین کے درمیان پسند کیے جانے کی وجوہات میں اس کی تعلیمی خصوصیت بھی نمایاں ہے۔ اردو بولنے والے ناظرین نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے یہ ڈرامہ دیکھتے ہوئے اسلامی تاریخ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا موقع پایا ہے اور یہ معلومات اپنی روزمرہ کی زندگی میں شامل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ خصوصاً عثمانی دور کو اسلامی تناظر میں پیش کرنا، ناظرین کے لئے ایک اہم تعلیمی وسیلہ کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ ناظرین نے کہا ہے کہ وہ "کرولوش عثمان" ڈرامے کے تاریخی کرداروں کو دیکھتے ہوئے اسلامی اقدار کے مطابق زندگی گزارنے کے طریقوں سے متاثر ہوئے ہیں۔

ڈرامے کا تعلیمی مواد ناظرین کو اسلامی مذہب کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تاریخی اور دینی معلومات کی پیاس کو بھی پورا کرتا ہے۔ عثمانی سلطنت کی تاریخ اور اسلامی تاریخ کا ذکر ناظرین کی اس موضوع میں دلچسپی کو بڑھاتا ہے اور پرانے مسلمانوں کی بہادری اور قربانیوں سے ناظرین کو حوصلہ ملتا ہے۔اس طرح، ناظرین کے ماضی کے ساتھ تعلقات مضبوط ہو جاتے ہیں اور انہیں عثمانی سلطنت کی تاریخی کامیابیاں اور اسلامی اقدار کے بارے میں زیادہ گہرائی سے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلہ
دریافت

برصغیر پاک وہند سے ناظرین کے تبصروں کی روشنی میں "کرولوش عثمان" ڈرامے کا ایک اور روحانی اثر یہ ہے کہ یہ ناظرین کو صحیح راستے پر چلنے اور اپنے دینی فرائض کی ادائیگی میں تحریک فراہم کرتا ہے۔ ناظرین اکثر بیان کرتے ہیں کہ ڈرامے کے کرداروں کا ہر حال میں اللہ پر بھروسہ کرنا، مشکلات کے سامنے جھکے بغیر جدوجہد کرنا جیسی خصوصیات سے انہیں حوصلہ ملتا ہے۔ ڈرامے کے کرداروں کی بہادری ناظرین پر گہرا اثر ڈالتی ہے؛ تبصروں کے مطابق اخلاقی اور دینی اقدار سے مضبوطی سے وابستہ ہونے کا زور دینا، ناظرین میں روحانی بلندی پیدا کرتا ہے۔ اس تناظر میں، ناظرین کے تبصرے ظاہر کرتے ہیں کہ ڈرامے کے کرداروں کی پیش کردہ یہ مثبت صفات روحانی تسکین فراہم کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں، ڈرامے کی مسلمانوں کے اتحاد پر دی جانے والی اہمیت ناظرین میں ہم آہنگی کے جذبے کو مضبوط کرتی ہے۔

"کرولوش عثمان" ڈرامے کے برصغیر پاک و ہند کے ناظرین کے درمیان پسند کیے جانے کی ایک اہم وجہ، اس ڈرامے کو دیکھنے والے بہت سے ناظرین کا یہ سوچنا ہے کہ بالی وڈ اور ہالی وڈ جیسے بین الاقوامی مقبول سیکٹرز اخلاقی اقدار کے لحاظ سے کمزور ہیں۔ تجزیہ کیے گئے تبصروں میں ان پروڈکشنز کی اسلام کو منفی انداز میں پیش کرنے کے بارے میں تنقیدیں، ناظرین کے "کرولوش عثمان" ڈرامے کی طرف مائل ہونے کے بنیادی اسباب میں شامل ہیں۔ ناظرین کی ایک بڑی تعداد کا ماننا ہے کہ "کرولوش عثمان" ڈرامہ اسلام کو صحیح اور حقیقی نقطہ نظر سے پیش کرتا ہے اور یہ امر ڈرامے کو پسند کیے جانے میں ایک فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے۔ لہٰذا، دینی مواد اور تعلیمی پروڈکشن کی طرف مائل ہونے کی خواہش ناظرین کی اس ڈرامے میں دلچسپی کے اہم محرکات میں شامل ہوتی ہے۔

ڈرامے پر عمومی تبصروں میں ناظرین کی اخلاقی مواد پر حساسیت نمایاں ہے۔ "کرولوش عثمان" ڈرامے کے پیروکاروں کی ایک اہم تعداد کی یہ خواہش ہے کہ وہ غیر اخلاقی مواد سے دور رہنا چاہتے ہیں، اور یہ انہیں اسلامی ڈراموں کی طرف لے جاتا ہے۔

"کرولوش عثمان" اور ناظرین کی تنوع تجزیہ کیے گئے تبصروں میں مختلف مذاہب کے ناظرین بھی "کرولوش عثمان" ڈرامے کو شوق سے دیکھتے ہیں اور اسلام کے لئے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ امر ظاہر کرتا ہے کہ ڈرامہ مختلف ثقافتوں کے درمیان ایک پل کا کردار ادا کرتا ہے۔

ترک ڈرامے دنیا میں سب سے زیادہ دیکھے جانے والے ڈراموں کی فہرست میں اپنی کامیابی ۲۰۲۴ میں بھی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اعداد و شمار کے مطابق ۲۰۲۰ سے ۲۰۲۳ کے درمیان ترک ڈراموں کی طلب میں ۱۸۴٪ کا اضافہ ہوا ہے۔[(۷)] کرولوش عثمان" ڈرامہ اپنی اعلیٰ پروڈکشن کے معیار کے ساتھ نمایاں ہے اور اس امر نے عالمی سطح پر وسیع ناظرین کے حلقے تک پہنچنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ تجزیہ کیے گئے تبصروں میں اکثر نمایاں ہونے والا پہلو ڈرامے کی پروڈکشن کا معیار ہے۔ تبصروں میں کہا گیا ہے کہ ڈبنگ کا معیار اور دلکش ویژول، ناظرین کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ ان تمام عناصر کا مجموعہ، "کرولوش عثمان" ڈرامے کو دیگر مواد کے مقابلے میں زیادہ دلچسپی کا باعث بناتا ہے۔ ناظرین نے ڈرامے کی پروڈکشن کے معیار کو نمایاں کرتے ہوئے، اسے دیکھنے کے لئے اپنے انتخاب کی سب سے اہم وجوہات میں سے ایک قرار دیا ہے۔

"کرولوش عثمان" ڈرامے کو ناظرین کی جانب سے ترجیح دینے کی ایک اور اہم وجہ، ڈرامے کے کرداروں کی بہادری اور ایمان والی شخصیتوں کا ناظرین پر گہرا اثر ڈالنا ہے۔ "کرولوش عثمان" عثمانی سلطنت کے قیام کی کہانی بیان کرتا ہے۔ اس ضمن میں، عثمان غازی کی

جدوجہدوں کو اور بالا خاتون کے ساتھ اس کی محبت کی کہانی کو شامل کیا گیا ہے۔ اس محبت کے پہلو کو خاص طور پر بین الاقوامی فروخت کے لئے پروڈیوسرز کی جانب سے اجاگر کیا گیا ہے۔ (۸) تجزیہ کیے گئے تبصروں کے مطابق، عثمان بیگ، بالا خاتون اور ڈرامے کے دیگر نمایاں کرداروں کی کہانیاں ناظرین کو تحریک اور حوصلہ دیتی ہیں اور ہر حال میں اللہ پر بھروسہ کرنے کی ترغیب دیتی ہیں۔

"کرولوش عثمان" ڈرامے کے نشریاتی حقوق رکھنے والے سب سے زیادہ سبسکرائبرز والے "Kurulus Osman Urdu by atv" یوٹیوب چینل سے حاصل کردہ ڈیٹا کے تجزیہ کے نتیجے میں "کرولوش عثمان" ڈرامے کے برصغیر پاک وہند کے ناظرین کے درمیان دیکھے جانے کی بنیادی وجہ، ڈرامے کے اسلامی اور روحانی اقدار کو نمایاں کرنے کی اہمیت ہے۔ تجزیہ کیے گئے ہزاروں تبصروں میں ناظرین نے بیان کیا کہ انہوں نے ڈرامہ دیکھتے ہوئے اپنے ایمان کو تازہ کرنے، اسلامی تاریخ کے بارے میں جاننے، اسلام کے بنیادی اقدار سیکھنے اور مسلمانوں کی بہادریوں سے روحانی تحریک حاصل کرنے کا موقع پایا ہے۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ ڈرامہ برصغیر پاک وہند کے ناظرین کے لئے ایک قسم کی روحانی رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ شہادت، بہادری، اللہ پر اعتماد اور ڈرامے میں پیش کیے جانے والے اسلامی موضوعات ناظرین پر گہرے اثرات ڈالتے ہیں اور ان عناصر نے ڈرامے کے دیکھے جانے کی شرح میں اضافہ کیا ہے۔

"کرولوش عثمان" ڈرامے کے یوٹیوب ناظرین کی ایک بڑی تعداد نے متبادل میڈیا مواد کے مقابلے میں ترجیح دی ہے۔ ناظرین کی ایک بڑی تعداد کا ماننا ہے کہ بالی ووڈ اور ہالی ووڈ پروڈکشنز اخلاقی اقدار کے لحاظ سے کمزور ہیں، اور ڈرامے کے دینِ اسلام کو صحیح اور حقیقی نقطہ نظر سے پیش کرنے کی وجہ سے ڈرامے میں دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ ناظرین کی اخلاقی مواد پر حساسیت، اسلامی ڈراموں کی طرف مائل ہونے کا ایک اور عنصر ہے۔ ناظرین کے تبصروں کے مطابق، "کرولوش عثمان" ڈرامہ برصغیر پاک وہند کے ناظرین کو نہ صرف تاریخ بلکہ دین کی صحیح رہنمائی فراہم کر کے ان کے روحانی پہلوؤں کی پرورش کرتا ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ بینجمن جے جے لیف، پاپولر کلچر ایز ہسٹاریکل ٹیکسٹ: یوزنگ ماس میڈیا ٹو ٹیچ امیریکن ہسٹری، دی ہسٹری ٹیچر، جلد ۵۰، شمارہ ۲، ۲۰۱۷ء، ص ۲۲۷-۲۲۸

۲۔ ندیم کارادومان، پاپولر کولتورون اولوشماسندہ و اکتاریلمسندہ سوسیل مدیانن رولو، ارجیس یونیورسٹی سوسیال بیلملر انستیتوسی درگیسی، جلد ۱۳، شمارہ ۴۳، ۲۰۱۷ء، ص ۲۰

۳۔ بہار اوزترک، ابوذر چیتنکایا، پانڈمی دؤنمندہ بیر انگیتیم آراچ اوالاراق تیلیویزون: تی آر ٹی ای بی ای ٹی وی، اینونو یونیورسٹی ایلیتیشیم فاکولتے سی الترونیک درگیسی (İNİF E-درگی)، جلد ا، شمارہ ا، ۲۰۲۱ء، ص ۱۴۲-۱۴۱

۴۔ نادیہ سلیم، صبا صادق، ترکش ڈراملار وایتس انفلکتس اون کولتور آو پاکستان، دی کیمونیکیشن رووییو، جلد ا، شمارہ ا، ۲۰۲۱ء، ص ۲-۳

۵۔ اودے م. ی. جارنہ، یوموشاک گوچ اولاراق ترک تاریخی دیزیلری واکا آراشترماس، درلیش ارطغرل و کرولوش عثمان، دیزیلرینین فیلیستین توپلوموا وزیرند کی اتکیسی، قونیہ، سلجوق یونیورسٹی، دکتور آف فیلوسوفی تیزی، ۲۰۲۳ء، ص ۶۸

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024
تحقیقی وتنقیدی مجلہ
دریافت

۶۔ دریا نجاروغلو، ترک تاریخ دیزیلریندہ یوکسلن عثمانلی میتی، کاستامونو ایلیتیشیم آراشترمالاری درگیسی، شمارہ ۱۲، ۲۰۲ء، ص۱۵۰-۱۷۳۰

۷۔ محمد سیزائی ترک، ترک دیزیلرینین کولتورل باگلامدا دونیاداکی اتکیلیری، تی آرٹی اکیڈمی درگیسی، جلد ۹، شمارہ ۲۲، ۲۰۲۴ء، ص۹۳۵

۸۔ فاطمہ مراد، گوکخان گوکگوز، ترک دیزیلرینین تاریخ کورگوسو، محشتم یوزیل، ایتخت عبدالحمید، کرولوش عثمان، کاستامونو ایلیتیشیم آراشترمالاری درگیسی، شمارہ۸، ۲۰۲۲ء، ص ۱۳۷

References in Roman Script:

1. Benjamin J. J. Leff, “Popular Culture as Historical Text: Using Mass Media to Teach American History”, The History Teacher, V. 50, No: 2, 2017, P. 227-228
2. Nedim Karaduman, “Popüler Kültürün Oluşmasında ve Aktarılmasında Sosyal Medyanın Rolü”, Erciyes Üniversitesi Sosyal Bilimler Enstitüsü Dergisi, V. 31, No: 43, 2017, P. 20
3. Bahar Öztürk, Abuzer Çetinkaya, “Pandemi Döneminde Bir Eğitim Aracı Olarak Televizyon: TRT EBA TV”, İnönü Üniversitesi İletişim Fakültesi Elektronik Dergisi (İNİF E-Dergi), V. 6, No: 1, 2021, P. 142-144
4. Nadia Saleem, Saba Sadiq, “Turkish dramas and its effects on Culture of Pakistan”, The Communication Review, V. 1, No: 1, 2021, P. 2-3
5. Oday M. Y. Jaarneh, “Yumuşak Güç Olarak Türk Tarihi Dizileri Vaka Araştırması: ‘Diriliş Ertuğrul ve Kuruluş Osman’ Dizilerinin Filistin Toplumu Üzerindeki Etkisi”, Konya, Selçuk Üniversitesi, Doctor of Philosophy Tezi, 2023, P. 68
6. Derya Nacaroğlu, “Türk Tarih Dizilerinde Yükselen Osmanlı Miti”, Kastamonu İletişim Araştırmaları Dergisi, No: 12, 2024, P. 150,173
7. Mehmet Sezai Türk, “Türk Dizilerinin Kültürel Bağlamda Dünyadaki Etkileri”, TRT Akademi Dergisi, V. 9, No: 22, 2024, P. 935
8. Fatma Murat, Gökhan Gökgöz, “Türk Dizilerinin Tarih Kurgusu: ‘Muhteşem Yüzyıl’, ‘Payitaht Abdülhamid’, ‘Kuruluş Osman’”, Kastamonu İletişim Araştırmaları Dergisi, No: 8, 2022, P. 137

Dr. Muhsin Ramazan İşsever works as a Research Associate in the Department of Eastern Languages and Literatures, at the Faculty of Letters, Istanbul University, Türkiye, specializing in the Subdepartment of Urdu Language and Literature. Throughout his career, he has published numerous articles and presented papers at various national and international conferences. His research interests include Urdu fiction and the Islamic history of the Indian Subcontinent.

Ms. Zeynep Altınköprü received her MPhil degree and is currently pursuing her Ph.D. in the Department of Eastern Languages and Literatures at the Faculty of Letters, Istanbul University, Türkiye. She has been working in the media sector as a Digital Content Specialist in Istanbul, Türkiye. Her current research interests focus on Urdu language and literature.

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلہ
دریافت

Received: 11th Aug, 2024 | Accepted: 15th Dec, 2024 | Available Online: 31st Dec, 2024
Digital Object Identifier: 10.52015/daryaft.v16i02.405

معاصر بلوچستانی اردو نظم کا اساطیری اور داستانوی رنگ

Mythological and Fictional Color of Contemporary Urdu Poem of Baluchistan

DR. QANDEEL BADAR
Assistant Professor, Department of Urdu, Sardar Bahadur Khan Women's University Quetta, Pakistan
(qndil78@gmail.com)

ABSTRACT After the formation of language, the first link of human mind and civilization is the establishment of mythology. It would not be wrong if mythology is said to be the oldest form of literature in the world. Mythological style of expression is closely related to the genre of poem.

In Urdu poem, the mythological and fictional color was present in different forms from the beginning, which started to be more refined after 60s. In this period, a world of mythological symbols, religious and folk allusions got settled in the poem which expanded its scope of meanings.

The post 21st century poems have succeeded in creating a distinct identity due to their mythological atmosphere. Contemporary Baluchistan poetry has created a special way of creating new myths by grasping the atmosphere and linguistic system of mythology.

Mythology appears to be used in many forms in the poem of Baluchistan, either retelling of mythological stories through which many new meanings are created, or an event or character from an old myth with new features, is described. While in the third case, on the basis of different myths or by grasping the mythological atmosphere and language, new myth is fabricated. This third case is the most desirable for the current poem. In the tribal poetry of Baluchistan, all mythological elements and fictional style have been present with their full essence from the beginning. By adding all the characteristics of the present complex prospect to this essence, the leaven of contemporary Baluchistan Urdu poetry has been created. This paper is based on this specific study of poem.

Key words: Baluchistan, Urdu Poem. Mythology, Fiction, Tribal Poetry, Folklore, Allusion, Symbol, Contemporary, Prospect, Characteristics.

اساطیر سے متعلق دست یاب معلومات اور مباحث کی ذیل میں ماہر نفسیات سگنڈ فرائیڈ، کارل ژونگ، اور لیوی اسٹر اس کا کردار بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس ضمن میں صرف ژونگ کی تحقیقی محنت کے حوالے سے سہیل احمد خان کی یہ رائے ملاحظہ کیجیے:

"ژونگ نے ایک اندازے کے مطابق تقریباً سڑسٹھ ہزار خوابوں کا تجزیہ کیا۔ ان خوابوں کی تمثالوں کے ذریعے سے وہ ان اساطیری وضعوں تک پہنچا جو دنیا بھر کی لوک کہانیوں، حکایات اور اساطیر میں ملتی ہیں۔ ان کے آفاقی ہونے کا مطلب یہی ہے کہ یہ

This work is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)

لاشعور کی ترجمان ہیں۔"(۱)

کارل ژونگ تمام تخلیقی فنون کو دو کیفیات کا محتاج بتاتا ہے جو اس کے لیے خوراک اکٹھا کرتی ہیں۔ جنہیں وہ نفسی اور غیبی کیفیت کا نام دیتا ہے۔ نفسی شعور جب کہ غیبی لاشعور کی پروردہ ہے جسے وہ انسان کے اجتماعی لاشعور سے جوڑتا ہے۔ انسان کا یہ اجتماعی لاشعور زبان کی صورت منتقل ہوتا رہا ہے۔ زبان اس کے مطابق اولین انسانی تخیل جسے آرکی ٹائپل تصور کہا جاتا ہے، کی نمائندہ ہے، جس میں واضح مفاہیم موجود نہیں لیکن یہ در حقیقت مفاہیم کی آماج گاہ ہے۔ بیسویں اور اکیسویں صدی کی تند و تیز بے رحم لہروں نے آرکی ٹائپ تصورات جو زمانی پینڈے میں کہیں بے حس و حرکت پڑے تھے، کو جھنجھوڑ کر پھر سے سطح پر نمودار کر دیا ہے۔ معاصر نظم کا گہرا مطالعہ اس امر کا غماز ہے کہ یہی تصورات اس کی عصری صورت گری کرنے میں عمل انگیز کی طرح کام کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر قاضی عابد رقم کے یہ قول:

> "اساطیر کا تعلق اگرچہ ماضی سے ہوتا ہے لیکن اگر غور کریں تو یہ انسان کے حال میں زندہ ہوتی ہیں کیوں کہ یہ انسان کے عقیدے سے متعلق ہوتی ہیں۔ مستقبل کی اساطیر وہ ہیں جو حال میں جنم لے رہی ہیں۔ عام عقیدہ تو یہی ہے کہ سائنس و شعور کے زمانے میں یہ محیر العقو لکہانیاں کیا جواز رکھتی ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے، آج بھی اساطیر بن رہی ہیں۔ انسانکے ذہن کو اس نوع کی کہانی کے ساتھ کوئی ازلی نسبت ہے۔"
> (۲)

زبان کی تشکیل کے بعد انسانی ذہنی ارتقا اور تہذیبی بنیاد کی پہلی اینٹ اساطیر کا وجود میں آنا ہے۔ اساطیر لفظ اسطورہ سے مشتق ہے اس عربی لفظ کے معنی افسانہ، کہانی یا لغویات کے ہیں۔ اسطورہ، انگریزی لفظ متھ (myth)، جو یونانی لفظ (mythos) سے ماخوذ ہے، کے متبادل کے طور پر اردو میں رائج ہوا جس سے مراد زبانی ادا کیے گئے الفاظ ہیں۔ یعنی اصطلاح کے مطابق اساطیر وہ قصے تھے جو قصہ گو زبانی سنایا کرتے تھے۔ در حقیقت اساطیر دنیا بھر میں ادب کی قدیم ترین شکل ہے۔ ابتدائی طور پر انسان نے کائنات اور اس میں مقیم تمام موجودات سے متعلق جو بھی خیال آرائیاں کیں، اساطیر نے انھیں سے جنم لیا۔ لیکن تاحال اساطیر کے مفاہیم سے کماحقہ آگاہی نہیں ہو سکی جس کی کئی وجوہات بتائی جاتی ہیں۔ اساطیر کو سمجھنے کی راہ میں سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ یہ کہانیاں ایک دوسرے سے گہری مماثلت رکھتی ہیں، ایک کہانی کو سمجھنے کے لیے کئی کہانیوں میں سفر کرنا پڑے گا۔ ان کہانیوں کا ایک اپنا علامتی نظام ہے بالکل اسی طرح جیسے مشرقی غزل کی روایت سے ناواقفیت، غزل کی شعر سے مکمل لطف لینے کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے۔ اساطیر کے معنی تک بھی ان کے مجموعی مطالعے ہی سے رسائی ممکن ہے۔ دوسرا اہم مرکزہ ثقافتی نشانات ہیں جن کی تفہیم کے بغیر اساطیر کے مکمل مفاہیم ہاتھ نہیں آسکتے۔ لیکن دلچسپ امر یہ ہے کہ ان ابہام کے باوجود ہم اساطیر میں چھپے معنی سے رجوع کر پاتے ہیں۔ ماہرین اس کی وجہ بنیادی انسانی ذہن میں موجود اکائی یا یکسانیت کو قرار دیتے ہیں۔ انسان کا اولین احساساتی اور کائناتی نظام سے متعلق سادہ منطقی اظہار اساطیر ہی ہیں۔ موجودہ تحقیق تک اس سے قبل کے اظہاریے وجود نہیں رکھتے۔ یہ رسم الخط کی ایجاد سے بھی بہت پہلے کے ماخذات ہیں۔ لیکن ان میں ابتدائی

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

انسان کے تہذیبی اور ذہنی سفر کی مکمل کہانیاں محفوظ ہو چکی ہیں۔ اساطیری کہانیوں کا سلسلہ یونان و روم سے لے کر ہندوستان تک پھیلا ہوا ہے۔ ان کہانیوں کے موضوعات زیادہ تر مذہبی یا تمثیلی نوعیت کے حامل ہیں اور یہ انفرادی کی بہ جائے اجتماعی انسانی زندگی کی پیش کار ہیں۔ اگر ان کہانیوں کے مفاہیم کھل جائیں تو انسان کی تمدنی زندگی کا آغاز کی ساری گرہیں کھل جائیں۔ انسان میں اساطیر خلق کرنے کی صلاحیت قدرتی طور پر موجود بتائی جاتی ہے۔ ذکاالدین شایان بیسویں صدی کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں:

"اب موجود لمحات میں زندہ رہنے والا شخص ماضی حال اور مستقبل کی تمام پرچھائیوں کا قیدی تھا۔ صدیوں پہلے کے مذہبی، دیومالائی اور داستانی واقعات، مہیب اور دیو قامت مجسمے، مافوق الفطرت مظاہر جن، دیو، پری، اُڑن کھٹولے اور خوف ناک لمبے چوڑے جسیم حیوانات وغیرہ نئے انسان کے ذہن و خواب مین از سر نو بیدار ہوئے اور ان کی پرچھائیوں میں آدمی کی بنائی ہوئی تمام مصنوعی اور مشینی دنیا کی دیو قامتی پست اور چھوٹی ہو گئی۔"(۳)

اساطیر کے ذریعے قدیم انسان خود کو درپیش مسائل اور اپنے سوالات 'کیوں اور کیسے' کے جواب کے ڈھونڈتے تھے۔ ان کے مسائل و سوالات کا بنیادی پیش خیمہ کائنات کی تخلیق کے اسباب و وجوہات کی تلاش تھا۔ انسانی بے بسی، قوت کی کمی اور بالخصوص موت وہ اسباب تھے جن کے سامنے وہ خود کو لاچار متصور کیا کرتے تھے۔ انسانی قوتوں کی معراج کا حصول ان کا دیرینہ خواب تھا چوں کہ دیوی دیوتا ان کے لیے سپر پاور ہوا کرتے تھے لہذا اپنے گھڑے ہوئے بے شمار دیوی دیوتاؤں سے مدد اور طاقت طلب کرتے رہتے تھے۔ ان خود ساختہ دیوی دیوتاؤں کے عادات و خصائل تو انسانی ہی ہوتے تھے البتہ طاقت اور صلاحیت میں یہ انسانوں سے کئی گنا بڑھے ہوئے تھے۔ قدیم اساطیر کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ یہ غیر منطقی ہوتے ہوئے بھی منطقی لگتی ہیں، لایعنی ہوتے ہوئے بھی سچی معلوم ہوتی ہیں، مضحکہ خیز ہوتے ہوئے بھی انسانی حیرت و استعجاب کو بہترین طریق پر بیان کرنے پر قدرت رکھتی ہیں۔ ان تمام تر غیر منطقی عناصر کے باوجود ان میں ابتدائی انسانی زندگی سے جڑی سچائیاں محفوظ ہیں جو تمام تر انسانی تہذیبی زندگی کے ارتقا کی ترجمانی کرتی ہیں۔ موجودہ ترقی یافتہ دور کا انسان اب بھی جب کائنات اور نظام کائنات پر تفکر کرتا ہے تو اس طلسماتی حیرت کدے کی کوئی کلید اس کے ہاتھ نہیں آتی، کائناتی نظام کے بھید اور اسرار تاحال انسان پر منکشف نہیں ہو سکے تو قدیم انسان کی اس متعلق سوچ بچار اور اس کا اساطیر میں ظہور، کوئی اچھنبے کی بات نہیں ہے۔

بیش تر اساطیری ماہرین اسطورہ کو ملحدانہ یا وثنی دور سے جوڑتے ہیں۔ تمام مذہبی صحائف میں انھیں خرافات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اساطیر کو مذہب سے منتھی کرنے کی روایت قدیم ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں مذاہب کی طرز پر خیر و شر کی باہمی کشمکش اور طاقت کا بیانیہ اساطیر کا بھی بنیادی موضوع ہے، یہاں دلچسپ امر یہ ہے کہ اکثر صحائف پر بھی اساطیری متن کے اثرات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ علی عباس جلال پوری نے اپنی کتاب "روایاتِ تمدنِ قدیم" میں دنیا کی پہلی رزمیہ نظم کی بابت فراہم بنیادی معلومات پر روشنی ڈالی ہے نیز دنیا

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلہ
دریافت

کی قدیم ترین نظم کا متن بھی درج کیا ہے، اس نظم کا ترجمہ سید سبط حسن سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہ نظم یہاں درج کرنا ضروری ہے تا کہ ابتدائی نظمیہ متن سے واقفیت حاصل ہو اور اس کی روشنی میں موجودہ نظم کا اساطیری رخ بھی واضح ہو سکے۔ علی عباس جلال پوری کے بہ موجب:

"دنیا کی اس (گل گامش کا رزمیہ) رزمیہ کا شمار دنیا کی قدیم ترین نظموں میں ہوتا ہے۔ گل گامش کے رزمیے میں عالم گیر سیلاب کا قصہ بھی ملتا ہے جو اتا پُشتم کی زبانی بیان ہوا ہے۔"

"بنی نور انسان کا شور و غل برداشت سے باہر ہو گیا ہے / اور ان کی بکواس کے باعث اب سونا محال ہے / پس دیوتاؤں کے دل میں سیلاب کا خیال آیا / لیکن میرے آقا ایانے مجھے خواب میں خبر دار کر دیا / اس نے دیوتاؤں کی باتیں چپکے چپکے میرے جھاؤ کے گھر کو بتا دیں / اوشرّ و پاک کے انسان اُوبار اُتُوتو کی اولاد! / اس گھر کو ڈھا دے اور ایک کشتی بنا۔۔ / تیرے جہاز کا ناپ یہ ہو / اُس کی شہتیر اُس کے طول کے برابر ہو / اُس کے عرشے کی کی چھت محرابی ہو / اُس قوس کہ مانند جو عالمِ سِفلی کو ڈھانپے ہوئے ہے / تب تمام جاندار مخلوق کے تُخم کشتی میں رکھ لے۔۔ / طلوعِ سحر کی پہلی تابانی کے ساتھ میرے گھر کے لوگ میرے گرد جمع ہوئے / بچے رال لے آئے اور مرد ضرورت کی دوسری چیزیں / پانچوں دِن میں نے جہاز کا پیندا بنایا اور خم دار لکڑیاں جوڑیں / اَور تب میں نے تختہ بچھایا / جہاز کی نچلی منزل کا رقبہ ایک ایکڑ تھا / اَور بالائی عرشے پر ہر جانب ساٹھ گز تھا / اُس کے نیچے میں نے چھ طبقے بنائے کُل سات / اَور اُن کو میں نے نَو طبقوں میں تقسیم کر دیا / اَور حسبِ ضرورت پچڑ بھی ڈالے / میں نے چپوؤں اور لمبے شہتیروں کا بندوبست بھی کر لیا / اَور ضرورت کی سب سب چیزیں فراہم کر لیں / باربردار پیپوں میں تیل لے آئے / میں نے تارکول، ڈامر اور تیل کو بھٹّی میں ڈالا / جہاز کی درزیں بند کرنے میں بہت سا تیل خرچ ہُوا۔۔ / میں نے سونا چاندی، زندہ مخلوق، گھر کے لوگ عزیز رشتہ دار / مویشی، جنگلی اور پالتو جانور اور سب کاریگروں کو جہاز میں بھر لیا۔۔ / تَب شام ہوئی اور طوفان کے راکب نے بارش شروع کی / میں نے باہر جھانک کے دیکھا تو موسم نہایت خطرناک تھا / پس میں بھی جہاز میں سوار ہو گیا اور دروازے کو بند کر لیا / اب سارا انتظام مکمّل تھا، دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔۔ / طوفان سارا دن شور مچاتا رہا / اور اُس کی برہمی ہر لحہ بڑھتی رہی / طوفان کے تھپیڑے فوجی حملوں کی مانند لگتے رہے / بھائی اپنے بھائی کو نہ دیکھ سکتا تھا / اور زمین کے ہر رہنے والے آسمان سے بھی نظر نہ آتے تھے / یہاں تک کہ سیلاب نے دیوتاؤں کو بھی دہشت زدہ کر دیا۔۔ / چھ دن اور چھ رات آندھی چلتی رہی / بارش، طوفان، اور سیلاب نے دُنیا پر غلبہ پا

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

لیا / ساتواں دِن طلوع ہوا تو جنوبی طوفان تھم گیا / سمندر پُر سکون ہو گیا اور سیلاب رُک گیا / میں نے رُوئے زمین پر نگاہ دوڑائی تو وہاں کامل سکوت تھا اور انسان مٹّی کے ڈھیر بن گئے تھے ___ / اِکیس کوس کے فاصلے پر مجھے ایک پہاڑ نظر آیا اور میری کشتی وہاں جا لگی / میری کشتی کوہِ نصیر پر رُک گئی اور پھر ہلائے نہ ہلی۔ / پانچواں دِن طلوع ہُوا تو میں نے ایک فاختہ کو آزاد کیا / وہ اُڑ گئی مگر اُسے بیٹھنے کے لیے کوئی خشک جگہ نہ ملی اور وہ واپس آ گئی / تب میں نے ایک ابابیل کو آزاد کیا / وہ اُڑی مگر بیٹھنے کے لیے کوئی خشک جگہ نہ ملی اور وہ واپس آ گئی / تب میں نے ایک کوّے کو آزاد کیا / اُس نے دیکھا کہ پانی پیچھے ہٹ گیا ہے / پس اُس نے اپنا پیٹ بھرا، اِدھر اُدھر اُڑ تا اور کاؤں کاؤں کرتا رہا مگر واپس نہ آیا / تب میں نے جہاز کے دروازے اور کھڑکیاں کھول دیں / میں نے قُربانی کی اور پہاڑ کی چوٹی پر شراب لُنڈھائی / میں نے سات دیگچے چولہے پر رکھے اور لکڑی، بید، دیودار اور حِنا کا انبار لگایا / اُن کی خوشبو دیوتاؤں تک پہنچی / تو وہ مکھیوں کی طرح چڑھاوے کے گِرد جمع ہو گئے "

(کتاب میں اس کے بعد عہد نامہ قدیم میں درج نوح کا قصہ درج کیا گیا ہے جس کے بعد وہ لکھتے ہیں)۔۔عہد نامہ قدیم کا یہ بیان ظاہراً سمیری قصے سے ماخوذ ہے۔لیونارڈ وولے جس نے شہر اُرک کی کھدائی کی تھی اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ گل گامش کے رزمیہ کا سیلاب اور طوفانِ نوح واحد الاصل ہیں۔ہندوؤں کا سیلاب کا قصہ بھی بابل کے واسطے سمیریا ہی سے اخذ کیا گیا تھا۔"[۴]

علم الاصنام (Mythology) کے ماہرین کے مطابق تمام بنیادی علوم جیسے فلسفہ اور سائنس کی صورت پذیری میں، ان کے دائرہ کار کے تعین میں اساطیر کے کردار کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ابتدائی طور پر کائناتی معاملات پر تفکر کرنے والے اذہان بلاشبہ ادیب ہی تھے۔ انھیں کے تخیل سے پھوٹتے افکار نے ادھ کھلے بھیدوں سے متعلق سوچنے کی ابتدا کی۔ علوم کی بنیاد رکھنے میں ادب کے کردار سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اگر یوں کہا جائے کہ تمام علوم ادب ہی کی کوکھ سے جنمے ہیں تو بے جا نہیں۔ بعد ازاں ان کے اپنے اپنے دوائر وجود پذیر ہوئے۔ یہاں یہ سوال جنم لیتا ہے کہ ادب کی ابتدائی شکل کیا تھی؟ تا حال معلوم تحقیق کی روشنی میں تو ادب کی ابتدائی صورتیں بھی اساطیر ہی ہیں۔ یہ جواب کئی حوالوں سے قرینِ قیاس لگتا ہے۔ انسانی تخیل کی ابتدائی کارفرمائیاں، حیرتیں، تجسس یقیناً من گھڑت قصے کہانیوں میں ڈھلیں جنھیں اب ہم اساطیر کہتے ہیں۔ ابتدائی دانش سے ماخوذ ان اساطیری کہانیوں کی زیادہ تر تین بنیادی صورتیں گنوائی جاتی رہی ہیں:

۱۔ دیومالا: یہ کہانیاں دیوی دیوتاؤں اور ماورائی طاقتوں کی فرضی سرگرمیوں کو محیط ہوتی ہیں۔
۲۔ لیجنڈ یا ساگا: یہ وہ کہانیاں ہیں جو قومی سوچ کو کسی تاریخی واقعہ، جنگ یا یلغار کے ذریعے تحریک دیتی ہیں۔
۳۔ لوک کہانی / فوک لور: یہ کہانیاں تفریحی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے لکھی جاتی ہیں۔

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

اس میں کسی تامل کی گنجائش نہیں کہ انہی من گھڑت کہانیوں نے مابعد کئی اصناف کی صورت گری کی۔ داستانیں، مذہبی حکایات، رومانوی اور لوک کہانیاں، ڈرامہ، مثنویاں، اور رزمیہ شاعری کی سبھی اشکال زیادہ تر اساطیر ہی سے پھوٹی ہیں۔ افسانہ، حکایت، رومان سے لے کر خرافات تک کئی اہم اصطلاحات کو تاریخی کتب میں اسطورہ ہی کہا گیا ہے۔ یوں یہ کہنا بے جا نہیں کہ بیش تر ادبی اصناف کے تشکیلی دورانیے میں، ان کے خدوخال تراشنے اور سنوارنے میں اساطیر نے بہ طور عمل انگیز کے اپنا خصوصی کردار ادا کیا ہے۔ یوں موجودہ دور تک مختلف النوع اصناف میں تخلیق کی جانے والی اساطیر کی کئی صورتیں ظہور پذیر ہو چکی ہیں جن کی شناخت کے لیے ان کی درجہ بندی از بس لازم امر ہے۔ اسی طرح نت نئی اساطیر کی تخلیق بھی ہر ہر صنف میں اپنا وجود منوا چکی ہیں۔ ہمارے کچھ ناقدین اب بھی اساطیر کی تشکیلِ نو کو نہیں مانتے لیکن مغرب میں اس حوالے سے کافی کام ہوا ہے۔ اس حوالے سے فہیم اعظمی نے لکھا ہے:

> "جدید تخلیقی ادب میں اساطیر کا شعوری اور غیر شعوری استعمال بہت عام ہے۔ یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ جدید تخلیق کار قدیم تخلیقات سے انحراف بھی کرتا ہے لیکن اساطیر کے معاملے میں روایتوں پر انحصار بھی کرتا ہے۔"(۵)

اساطیری طرزِ اظہار اور نظم میں گہرا سمبندھ ہے۔ اردو نظم میں اساطیری اور داستانوی رنگ ابتدا ہی سے موجود رہا ہے لیکن بالخصوص ساٹھ کی دہائی کے بعد اس کے خدوخال مزید واضح ہونا شروع ہوئے۔ اسی دور میں نظم میں اسطوراتی علامات اور مذہبی اور لوک تلمیحات کا ایک جہان آباد ہونا شروع ہوا جس سے نظم کے معنوی دائرے میں وسعت پذیری در آئی اور اس کی تفہیم اور ابلاغ میں رکاوٹ۔ اکیسویں صدی کے مابعد تخلیق ہونے والی نظمیں اپنی اسطوراتی فضا ہی کی وجہ سے علیحدہ پہچان بنانے میں کامیاب ہوئی ہیں، پرانی نظم کی بہ نسبت یہی رخ موجودہ نظم کی وجہِ امتیاز ہے۔ معاصر نظم گو نے اسطورہ کی مجموعی فضا اور لسانی نظام کو گرفت میں لے کر نئی اساطیر گھڑنے کی خصوصی طرح ڈالی ہے۔ اب ان نئی اساطیر کا مطالعہ بھی دو سطحوں پر کیا جا سکتا ہے۔

اول۔ پرانی اساطیر کا نئے اسالیب اور نئے ڈھنگ میں بیان، جو کم کم دیکھنے میں آتا ہے۔

دوم۔ نئی اساطیر یا اساطیری اور پُر تحیر طرزِ بیان کی تشکیل اور اس کی جملہ صورتیں، جو موجودہ نظم میں کثرت سے دکھائی دیتی ہیں۔

بلوچستان کے شعری سیاق بالخصوص علاقائی زبانوں کے ادب اور شاعری میں اسطورہ ان تمام متذکرہ صورتوں میں موجود رہا ہے۔ ان میں لیجنڈ یا ساگا کا حصہ خصوصی توجہ کا حامل ہے۔ یہاں کا موجودہ ادبی منظر نامہ یہاں کی قبائلیت اور مقامی زبانوں میں کثرت سے تخلیق کردہ لیجنڈ اور لوک ادب کا پیش خیمہ ہے۔ یہاں کی قومی زبانوں کے ادب میں قبائلی زندگی کے قیام و دوام میں اہم اور بنیادی کردار ادا کرنے والے بہادر شخص (ہیرو) کی نبرد آزمائیاں اور فتح یابی کے قصے مقبولِ عام رہے ہیں۔ بلوچستان کی بڑی قبائلی تہذیبوں نے ہمیشہ سے اپنی بقا کے لیے باقاعدہ جنگیں لڑیں ہیں چناں چہ یہاں کا لوک ادب، بہادری اور سرخروئی کی انھی داستانوں سے بھرا پڑا ہے۔ غیرت، بہادری، اپنی املاک کی حفاظت اور قبائلی تفخر کا استحکام، ان داستانوں کے عام موضوعات ہیں۔ یوں یہاں کی قبائلی شاعری میں بھی اساطیر کی تمام مجتمع اشکال دستیاب رہی ہیں۔ قبائلی شاعری میں موجود متذکرہ تمام اساطیری عناصر اور داستانوی طرزِ بیان اپنے مکمل جوہر کے

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

ساتھ ساتھ، موجودہ عہد کی بہت سی خصوصیات سمیٹتے ہوئے معاصر بلوچستانی اردو نظم کی بنت میں شامل ہوا ہے۔ بلوچستان کا قبائلی رنگ ،لیجنڈ یا ساگا کا مکمل رنگ و آہنگ صادق مری کی ہر ہر نظم میں دیکھا جاسکتا ہے۔ یہاں کا بلوچی فوک لور جس تفصیل کے ساتھ ان کی نظم کا حصہ بنے ہیں اس کی مثال کسی اور کلام سے دینا ممکن نہیں۔ ان کی ایک نظم ملاحظہ کیجیے:

"دھند لکے میں کہاں تم کھو گئے بالاچ / کہیں کیا سو گئے بالاچ / اب اس سے پیشتر کچھ حادثہ ہو /
دیر ہو جائے / نکل آؤ کماں سے تیر کی صورت / کہ پھر سمی کی حرمت پر نہ حرف آئے / کہاں
کس اوٹ میں چٹان کی / گم ہو / کہاں اوڑھے ہوئے تم خاک / او جھل ہو / اٹھو دیکھو یہ بے گور
و کفن لاشہ / یہ دودا ہے / سکوت ایسا / کہ آہٹ چیخ سے بڑھ کر سنائی دے / دھند لکے میں کہاں
تم ہو / اب اس سے پیشتر کچھ حادثہ ہو، دیر ہو جائے / کسی سمی / کسی دودا، کی خاطر اب نکل آؤ
/ کماں سے تیر کی صورت / کوئی اڑتا پرندہ ہی دکھائی دے / کوئی نغمہ سنائی دے"

"بالاچ گورگیج" ایک بلوچ شاعر اور انتقام کا دیوتا جس نے ایک خاتون "سمی" کی حرمت پر جان دینے والے اپنے بھائی "دودا" کا دشمنوں سے انتقام لیا۔

(۹)
(دھند لکے میں اٹھو بالاچ! ، صادق مری)

معاصر نظم میں موجود اساطیر کو اپنے پلاٹ، تکنیکی پیرائے، کردار سازی اور لسانی نظام سے شناخت کیا جاسکتا ہے۔ کائنات کی مقناطیسی گردش و ماورائیت، زمان و مکان کا لا محدود و مبہم تصور، ازل سے ابد تک کا نا مختتم سفر، تہذیبی تبدیلیاں اساطیر کا مواد بنتی رہی ہیں۔ یہ مفروضاتی و تخیلاتی مواد ادب کے بھی تار و پود میں گندھا ہوا ہے۔ اساطیر کی پُر تحیر، تخیلاتی، طلسماتی فضا داستانوں، سفر ناموں اور افسانوں کی ساخت میں بُن دی گئی ہے۔ اساطیری کردار جن، بھوت پریت، دیوی دیوتا ہوں یا انسان، پرندے اور جانور ہوں دونوں صورتوں میں ان کی خوبیاں مافوق الفطرت ہوتی ہیں۔ ان میں ہیرو، سپر مین یا جادوگروں جیسی خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔ تفکر کریں تو غزل میں محبوب، قصیدے میں بادشاہ اور مرثیوں میں مذہبی اصحاب کی ماورائی خصوصیات اور متذکرہ کارنامے، اساطیری اثرات ہی کے حامل ہیں۔ عصری بلوچستانی نظم میں اساطیر کے استعمال کی سبھی اشکال نشان زد کی جاسکتی ہیں۔ لیکن مختلف اساطیر کو بنیاد بنا کر یا اساطیری اندازِ بیاں کو گرفت میں لے کر خود اسطوراتی فضا گھڑنا، یہ صورت یہاں کی نظم کو سب سے زیادہ مرغوب ہے۔ منیر مومن بلوچی زبان کے نمائندہ شاعر ہیں۔ ان کی نظم اپنے علامتی و اساطیری پیرایہ کے حوالے سے اپنی خصوصی شناخت رکھتی ہے۔ یہاں ان کی ایک نظم کا اردو ترجمہ پیش خدمت ہے:

"دنیا۔ ایک ایسا شاندار گھر
جس سے باہر نکلنا بھول جاتے ہیں لوگ

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلہ
دریافت

زندگی۔۔
خدا کے بخشے ہوئے موسموں میں سے ایک موسم
اور عشق۔۔
خدا کے گھر سے چرایا ہوا ایک چراغ!
مجھے جتو کے جامن کے باغ کے
ان پہاڑی بیروں کی لذت بالکل یاد نہیں آتی
لیکن وہی بیر چرانے کا ذائقہ
میری زندگی کی شیریں ترین یاد ہے!
جب بھی تجھے دیکھتا ہوں
ایسا لگتا ہے
جیسے میں خدا کے کھیت میں
ایک عظیم الشان درخت سے
روشن بیر چرا رہا ہوں!"

(روشن بیر، منیر مومن، اردو ترجمہ: احسان اصغر) (۷)

اساطیر میں حیرت و استعجاب، تجسس و خوف، وسوسے و توہمات، ہیبت و وحشت جیسی کئی کیفیات کو متحرک کیا جاتا ہے جس کے لیے مخصوص زبان استعمال کی جاتی ہے۔ دراصل اساطیر اپنی زبان کی وجہ سے ہی قائم ہوتی ہیں۔ اساطیر کی زبان متفخرانہ بہ یک وقت چونکانے، ڈرانے، دھمکانے والی ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ رومانیت، داستانویت، ڈرامائیت اور افسانویت سے بھی بھرپور ہوتی ہے۔ علامتیت اس کا خاص وصف ہے جبکہ علامتیں زیادہ تر مناظر فطرت سے مستعار لی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اساطیر ادبی جمالیات کو اجاگر کرنے میں بڑی معاون رہتی ہیں اس لیے بھی ان کو تلف کرنا ممکن نہیں۔۔ اساطیر کے ذریعے نظم کے جمالیاتی اور ڈرامائی تاثر کو باآسانی بڑھایا جا سکتا ہے۔ اکثر شاعر غیر ارادی طور پر اساطیری اسلوب استعمال کرتے ہیں لیکن بلوچستان کی نظمیں اساطیری جمالیات کی پیش کش کا عمدہ نمونہ پیش کرتی ہیں۔ عدن عدیم کی نظمیں اپنی فضا، علامات اور کرداروں کے ذریعے موجودہ عصر کی اساطیری امیجز بڑی خوبصورتی سے تخلیق کرتی ہیں۔ مثال ملاحظہ کیجیے:

"درخت اُمڈے ہوئے ہیں اک دوسرے پہ / رستہ / مہیب سائے کی اُلجھنوں سے / نکل رہا ہے / طویل دُوری پہ دُور دِکھتا ہوا مسافر / قدیم رستے کو اپنے قدموں کی / چاپ دے کر / نکل گیا ہے / حروف ہیں، / لفظ ہیں ورق پر / مچلتی آواز اور ہاتھوں میں آبنوسی سرود ہے، / اور

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024
تحقیقی وتنقیدی مجلہ دریافت

سکوت ہے، سکوت ۔۔/ساکت/ہوا ساعت میں بج رہی ہے/سکوت ۔۔پھر بھی سکوت ۔۔ہے/رقص ہے/مسلسل ۔۔نمود ہے/اور جمود ہے/جمود ۔۔/جامد/نظر کی سرحد سے ماوراءتک/ہے جابہ جاتک/مدار اندر مدار لرزش/جمود۔۔/پھر بھی جمود۔۔ہے/اور نزول ہے/پہاڑ راتوں میں سرد کہسار/برف اَوڑھے کھڑے ہیں/سردی سے کانپتے ہیں/ساعتوں میں سکون بھرنے/سفر پہ چشمے نکل پڑے ہیں/تو برف/پھولوں کی طرح اُن پر/برس پڑی ہے/برستی بوندوں کی/پہلی سنکی دھمک سے نیندوں کی/نیند ٹوٹی/خمار ٹوٹا ہے/پیاس اُٹھی ہے ریگزاروں سے/دُھول ہو کر اُٹھا کے گرداب/ریت خود سے لپٹ گئی ہے/تھکن رسیدہ تمام چشمے/کمند پھینکے ہوئے ہیں/آتش فشاں میں مجذوب ہوگئے ہیں/طویل دُوری پہ/دُور دِکھتا ہوا مسافر/فلک پہ جاکر/زمین کی دھڑکن کو سُن رہا ہے/سمجھ رہا ہے/زمین زندہ ہے،/اُونگھتی ہے/درخت اُنڈے ہوئے ہیں اک دوسرے پہ/رستہ/مہیب سائے کی اُلجھنوں سے نگل رہا ہے"

(۸)
(Earth،عدن عدیم)

اساطیر گھڑنے کے لیے غیر معمولی صلاحیت درکار ہوتی ہیں اور دیومالائی اندازِ فکر بھی۔اسطورہ کے طرز پر پلاٹ بنانا پھر اسے افسانے یا نظم کی شکل دینا، فکری و فنی علویت کا متقاضی ہے جو خلاق تخلیقی کاروں کے حصہ ہے۔اس کے لیے کمال ریاضت اور خدائیداد صلاحیت درکار ہوتی ہے۔گہرے اور وسیع مطالعے کے ساتھ متخیلہ کی قوت کا بھی مضبوط ہونا بہت ضروری ہے۔دانیال طریر کی طویل نظم "خدا میری نظم کیوں پڑھے گا" ان تمام اسطوراتی خصائص سے مزین ہے جس کا تذکرہ کیا گیا۔اس نظم میں سے اساطیر کی نشان زد تمام اشکال بہ آسانی بہ طور مثال پیش کی جاسکتی ہیں لیکن یہاں ان کے نظمیہ مجموعے "معنی فانی" سے ایک نظم درج کی جارہی ہے جو "اسطورہ" کے عنوان کے تحت لکھی گئی مندرجہ ذیل نظم کئی حوالوں سے خصوصیت کی حامل ہے۔ نظم کے آخری دو مصرعوں کمال طریق سے نہ صرف نظم کی معنوی کایا پلٹ دی، بلکہ تمام من گھڑت قصوں پر حقیقت کی مہر ثبت کر دی ہے۔شاعر کے مطابق اگر اساطیر کو زمانوں کی قید سے آزاد کر دیا جائے تو یہ من گھڑت قصے کسی نہ کسی زمانے میں سچ ہو جاتے ہیں۔شاعر در حقیقت اس نظم میں تخلیق اور ادب میں مضمر اسی آفاقیت کو بیان کر رہا ہے کہ ادبی اساطیر ہوں، دیومالائی قصے، فرضی حکایتیں ہوں یا مافوق الفطرت داستانیں، جو آج جھوٹ یا لغو معلوم ہوتے ہیں وہ آنے والے زمانے میں حقیقت کا روپ دھارن کر لیتے ہیں یعنی ادیب کی نظر فردا جھانکنے پر قادر ہوتی ہے۔ نظم ملاحظہ کیجیے:

"میں نے اس عفریت کا قصہ سنا ہوا ہے
جس نے سورج پھانک لیا تھا

پربت پربت آگ بھری تھی، خشک رگوں میں
جس نے دھرتی کے سینے میں لاگ بھری تھی
زرد رتوں میں
گہری خاموشی کے منہ میں شور بھرا تھا
کال کنوئیں کا
جس نے فضا کی انگھیٹی پر تھال دھرا تھا
سرخ دھوئیں کا
رستہ رستہ ویرانی کے جال بچھائے، سائے اگائے
جس نے پیڑوں کی شاخوں پر سانپ بٹھائے، پھن پھیلائے
میں نے ماضی کا وہ حصہ چنا ہوا ہے
جس نے فردا جھانک لیا تھا"

(اسطورہ، دانیال طریر)[۹]

ساٹھ کی دہائی میں اردو افسانے میں بہت سی واضح تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں جن میں علامت اور اسطورہ کا کثیر استعمال شامل ہے۔ افسانے کے ساتھ ساتھ یہ علامتی اور اساطیری جہان معاصر نظم میں بھی غالب عنصر کی طرح موجود دکھائی دیتا ہے، جس کی کئی وجوہات ہیں۔ دنیا میں ترقی کی تیز رفتاری اور آئے دن کی رنگ بدلتی زندگی نے بالعموم بیسویں صدی اور بالخصوص اکیسویں صدی کے انسان کو مظاہر فطرت کی بجائے ترقی کے اس طاقت ور دیو کے سامنے بے بس بنا دیا ہے۔ ٹیکنالوجی کے بڑھتے عفریت نے کہیں نہ کہیں اس اساطیری فضا کو حقیقت ثابت کر دیا ہے جس کے بارے میں ابتدائی طور پر انسان قصے گھڑا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ عالمی طاقتیں جس زبان میں دنیا کے پس ماندہ ممالک سے مکالمہ کر رہی ہیں اسے بھی اساطیری زبان اور فضا کی پیش کش کے ذریعے ہی احاطۂ تحریر میں لایا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاصر نظم اسی محیر العقول فضا اور دیوی دیوتاؤں کے جاری کردہ احکامات کی طرز پر موجودہ سیاسی صورت حال کو پیش کر رہی ہے۔ بلوچستان میں تخلیق ہونے والی موجودہ نظم اساطیری فضا اور زبان کو گرفت میں لے کر معاصر بلوچستانی سیاسی تناظر کو کمال ہنر مندی سے پینٹ کرتی دکھائی دیتی ہے۔ نظمیں دیکھیے:

"یہ جنگل اب اور گھنا ہے
لہو میں ایک اک پیڑ سَنا ہے
چھدرا چھدرا سا جیارا
کوئی رستہ، کوئی تارا

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

تحقیقی و تنقیدی مجلہ
دریافت

کہیں نہیں اب کہ کہیں نہیں ہے
سنّاٹا ہے، تاریکی ہے
دھرتی جو زخمی زخمی ہے
ہر سمت آز و ہوس کی دلدل
حَبس کا ہر سو پھیلا جنگل
دہشت ناک درندہ آنکھیں
ہول بھری وحشی آوازیں
لمحہ بھر کو سنّاٹے میں
اُبھریں اور پھر گم ہو جائیں
سنّاٹا سا سنّاٹا ہے
گلی سڑی لاشوں کی بُو ہے
اور لہو ہے
جو بکھرا بکھرا ہر سُو ہے
مصلحتیں، خاموشی اَوڑھے کونوں کُھدروں میں دُبکی ہیں
ہر منظر بس لَہو سَنا ہے
عبرت کی تصویر بنا ہے"

(عبرت کی تصویر، عین سلام) (۱۰)

"میں تاریخ میں کہیں بھی موجود نہیں ہوں
مگر پوری تاریخ
تمام جینیٹک اوصاف کے ساتھ
کسی کمپیوٹر کی چِپ کی طرح
مجھ میں سما گئی
میری روح کی اداس آنکھوں کے دریچوں سے
جب کوئی خواب اندر آنا چاہے
تو روشنی کے پردوں پر

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلہ
دریافت

اساطیری کرداروں کے سائے
ہیولے بن کر رقص کرنے لگتے ہیں
میرے احساسات کے گھنے جنگلوں میں
اب بھی شیاطین کا بسیرا ہے"

(آفاقی روح، منتخب حصہ، غنی پہوال)(۱۱)

"ابولہول کی دنیامیں
فریادیں جو کرتے ہیں
اہراموں کے اندر سے
چیخوں سے یہ لکھتے ہیں
دیواروں کے اوپر بھی
رنگوں میں یہ چھپتے ہیں
تابوتوں کے کونے میں
"کا"نامی اک کوّا ہے
زندہ لاش کے سینے میں
پتھر سا دل رکھا ہے
سناٹا سا رہتا ہے
ابولہول کی دنیامیں
آج بھی ایسا ہوتا ہے
فریادیں جو کرتا ہے
فرعونوں کی آوازیں
اہراموں کے اندر سے
دہشت کی ہر آہٹ پر
چیخوں سے یہ لکھتی ہیں
ان کو بھی دفنا دیں گے
دیواروں کے اوپر سے

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

پتھر پھینکے جاتے ہیں
شام پہ سرخی چھاتی ہے
بے کس، بے بس، بیچارے
رنگوں میں چھپ جاتے ہیں
تابوتوں کے کونوں میں
ٹکڑے پھینکے جاتے ہیں
"کا" نامی اک کوّا بھی
زندہ لاشیں کھاتا ہے
دھک دھک کرتی ہیں آہیں
سناٹا سا چھاتا ہے
ابولہول کی دنیا میں
اہراموں کو موت نہیں...."

(فرعون زندہ ہیں، تمثیل حفصہ) (۱۲)

معاصر نظم میں اساطیر کی موجودگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ موجودہ عہد کے بیش تر شاعر مغرب و مشرق کے قدیم ادب (یونان، روم، مصر و بابل، مہاتما بدھ، رامائن، مہابھارت) نیز مذہبی صحائف (توریت، انجیل، قرآن) سے بھی کماحقہ واقفیت رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تمام لوک ادب بھی ہماری جڑوں میں موجود ہے۔یوں ہمارا تمام تہذیبی سرمایہ بہ صورت اساطیر ہمارے اجتماعی لاشعور کا حصہ بن چکا ہے۔ یہ انسانی ارتقا کا جزو لاینفک ہیں۔یوں اساطیر کا وہ حصہ جو اب ہماری تہذیب و تمدن، زبان، مذہب اور اسلاف سے جڑ گیا ہے، ہمارے رسوم و رواج میں داخل ہو گیا ہے، بلکہ یوں کہنا درست ہو گا کہ ہماری توارث (Genes) میں بہ طور پرنٹ کے شامل ہو چکا ہے، ہمارے شعر و ادب میں اس کی دہرائی کا عمل جاری رہے گا۔ بہ طور نمونہ چند نظمیں دیکھیے:

"تشدد کو الوہیت نہ کہنا
خدا کے مسترد فرمان کیا تم نے سنے ہیں
تمہیں معلوم ہے کہ حق اگر مقتول نہ ہو
باعثِ تقلید آدم ہو نہیں سکتا
کفن گننے سے شب سے
قتلِ امکانِ وفا سے

تمہیں فرصت کا وہ لمحہ ملا ہے
(جہاں شیطان اپنی کھال کو
تبدیل کرنے کے لیے اک مدتِ محدود چاہے تو)
بشارت خواب، نیکی سے بھری آنکھیں
فلک کے گہرے نیلے پانیوں کو
صرف انگارہ سمجھتی ہیں
جو انگارہ زمین کو خاک کرتا
اور فضا کو راکھ کرتا ہے
تمہیں اڑتے پرندوں سے محبت ہے!
محبت عہد نامہ ہے
زبورِ عصر کی متروک ہوتی اصطلاحوں کا
کسی فہرست میں کھوجو
کسی خاکسترِ زرّیں ورق پر
آنسوؤں کی ان بجھی تحریر میں ڈھونڈو
مگر تم جانتے ہو کہ محبت دستِ دل پر
اک مقدس بیعت نامختتم ہے
اور تمہارے ہاتھ پہ کتنا لہو ہے"

(بغداد کا آسماں، بیرم غوری)[۱۳]

"محبت ہے شہر اساطیر کا وہ پرندہ
کہ جس کے پروں کی سماوی رسائی
زماں سے زماں تک
نشاں سے نشاں تک رہے گی!
ابھی اس سمندر کی پہنائی میں ہیں
کئی لاکھ برسوں کی آئندہ ورفتہ لہریں
یہ لہروں کی مہتاب گاہیں

کہ جن کی رگوں میں رواں ہے کہیں صبحِ پیغمبراں
اور کہیں عصرِ مقتل
کسی لہر پر نقش، فرہاد و شیریں کے قصے
کہیں پر تصوف کی حیرت سرا
جہاں گونجتی ہے ابھی تک "اَنَاالحق" کی زخمی صدا
کراں تا کراں!
یہ وہ بے خودی ہے
کہ جس کی روایت میں زندہ ہیں اب تک
خلا و ملا کے مساکن،
یہ دریا،
یہ بےَ نم بیاباں،
یہ مٹی،
یہ مٹی کا اظہار

انساں!"(محبت، احمد شہریار) (۱۴)

"کہا مَیں نے وتایو!
بہت سخ ہے زمستاں
ضعیفی میں نحیفی
سہی جاتی نہیں بیٹے
تمہارا قرب ہے رب سے
تمہیں وہ خوب سنتا ہے
اُسے کہنا
ہمیں دوزخ سے تھوڑی آگ تو دے دے
وتایو نے کہا اماں!
وہاں تو جو بھی جاتا ہے
وہ من دھونی میں جَل بُھن کر

خود اپنی آگ اپنے سنگ
یاں سے لے کے جاتا ہے
جہنم کی تو اپنی آگ ہوتی ہی نہیں ہے! "
"وتایو فقیر"، سندھ کا ایک درویش منش لوک کردار

(آگ، عمران ثاقب)(۱۵)

مابعد جدید دور کے لکھاریوں نے تمام تر روایتی پیرایوں سے شدید بیزاری دکھائی ہے اور حتی الامکان ان سے انحراف کیا ہے۔ لیکن اساطیر کے معاملہ مختلف نوع کا حامل ہے۔ اس کی بنیادی وجہ اساطیر میں ہمہ وقت تازگی اور جدت کی صفت کی وجودگی ہے۔ کچھ ناقد اسے کلیشے سے تعبیر کرتے آئے ہیں لیکن دیگر اس کی تازگی، نئے پن اور کلیشے کو توڑنے کی صلاحیت کے معترف ہیں۔ کلیشے میں تبدیلی بھی حیرت و استعجاب اور فرحت کو جنم دیتی ہیں جو خود اساطیری دائرہ کار میں شامل ہے۔ آج دنیا بھر میں اساطیر کا سب سے بنیادی کلیشے "خیر و شر" کی جنگ اور خیر کی غالبیت، ہی توڑ پھوڑ اور شکست وریخت کا شکار ہو گیا ہے۔ آج جو اساطیر نظمیہ یا دیگر ادبی اصناف میں قلمبند ہو رہی ہیں وہ مثبت کی بجائے منفی قوتوں کے بیانیے پر مشتمل ہے۔ شر کی طاقت ور قوت کا مہابیانیہ۔ مابعد جدید دور میں منفی قوتیں خدائی قوت کی طرح دنیا سے ہم کلام ہیں اور فتح یابی بھی ان ہی کے حصے میں آ رہی ہے۔ خیر اور نیکی اور ان کی قوتوں کی کہانیاں اب واقعتاً اساطیری نوعیت اختیار کر گئی ہیں یعنی محض ماضی کی داستانیں بن کر رہ گئی ہیں۔ آج کے دور کی اساطیر سائنس فکشن کی صورت میں اپنی موجودگی کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ یا "بگ باس چاہتے ہیں" جیسی مشہور تشکیلی حقیقت کی طرز پر۔ موجودہ عصر میں شر کی تمام قوتیں خیر کی سبھی علامتوں پر غالب آ گئی ہیں۔ دنیائی خدائی قوتیں تیسری دنیا کے باسیوں سے کس طرح کلام کر رہی ہیں؟ کس طرح اپنی فتح کا جشن منا رہی ہیں؟ نوشین قمبرانی کی نظمیں اس کی بہترین عکاس ہیں۔ یہاں ان کی ایک نظم کا کچھ حصہ پیشِ خدمت ہے:

"جنگلوں میں گھنی جھاڑیوں سے نکلتی ہوئی
کس نے دیکھی تھیں
صحراؤں میں تشنگی ناپتی
ڈر کے غاروں میں سہمے ہوئے
چارپایوں کے تن پہ برستی ہوئی مہرباں وسعتیں؟

کیا خبر ان ابد گھاٹیوں سے پرے
ڈر کے غاروں میں سہمے ہوئے چارپائے کہیں
دورِ وحشت سے تہذیب تک کے بڑے

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

المیے کے ہوں پھر منتظر۔۔؟
اور اُن پر برسنے لگیں مہرباں ہو کے
شیطان گر وسعتیں۔"

(The Axiom of Infinity، منتخب حصہ، نوشین قمبرانی) (۱۶)

ہر قوم کچھ ایسے انفرادی تہذیبی خصائص کی حامل ہوتی ہے جو اسے دیگر اقوام سے ممیز کرتی ہے۔ چناں چہ یہی انفرادی اوصاف اس کی شناخت کو مستحکم کرنے میں معاونت کرتے ہیں۔ ان تہذیبی اوصاف کی تشکیل میں کئی عناصر شاملِ کار رہتے ہیں۔ ہر قوم اپنے جغرافیے، اپنی آب و ہوا، اپنے معاشی نظام، اپنے رہن سہن سے اپنا تہذیبی مزاج طے کرتی ہے اور پھر یہی مزاج اس کے فوک لور کو متشکل کرتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ فوک لور سے کسی بھی قوم کے تہذیبی مزاج کے خدوخال اخذ کیے جاسکتے ہیں تو بے جا نہیں۔ عتیق اللہ اپنے مضون "آرکی ٹائپ: تصور اور تنقید" میں رقم طراز ہیں:

" اسطور کے تاریخی ،نیم تاریخی ہیرو اور ان کے مخاطراتی کارنامے، مذہبی مہم جوئیاں، عوامی تہوار، تقریبات، اولیا، انبیا، اور ان سے منسوب محیر العقول معجزات، ان کے سوانح، فلسفی، دانش ور اور ان کے رہ نما اصول، لوک مسلمات، کہاوتیں، اقوال اور مقبول عام سینہ بہ سینہ چلے آنے والے روایتی قصے، حکایتیں اور محاضرات وغیرہ نسلی حافظے کا وہ متحرک مواد ہیں جو کسی قوم کی انفرادی اور اجتماعی تہذیبی و ذہنی تشکیل و تعمیر کرتے ہیں۔"(۱۷)

بلوچستانی اقوام ایسے ہی منفرد اوصاف کی حامل اقوام ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کا فوک لور بھی ایسے ہی انفرادی نقوش رکھتا ہے جنھیں اسی مٹی اور مزاج کے ساتھ جوڑ کر ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ بلوچستان کا منفرد پینوراما، یہاں کا لینڈ اسکیپ، تہذیب و تمدن و ثقافت، فوک لور، اہم تاریخی واقعات و کردار، زمینی، سیاسی اور معاشی حقائق، مسلسل کشاکش، مزاحمت و بغاوت، یہ سب رجحانات مل کر معاصر نظم کا خمیر بنتے ہیں مختصراً بلوچستان بنیادی مرکزے کے طور پر اس نظم کا محور و محرک ہے، معاصر نظم کے تمام شاخسانے اسی مرکزے سے پھوٹتے ہیں اور اسی کے گرد اپنا تانابانا بنتے دکھائی دیتے ہیں۔

موجودہ زندگی اپنے کُل میں ایک بالکل نئے اور بڑی حد تک ایک مبہم منظر نامے کی پیش کار ہے۔ سیاسی اور سماجی زندگی کے جملہ پہلو پیچیدگی کا شکار ہو چکے۔ موجودہ عہد کی پرت در پرت تہہ داری نے اساطیر کے تفریحی مقاصد کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ لیکن انھیں کی تخلیق کے نئے اسباب بھی پیدا کر دیے ہیں۔ ان کے اہتمام سے نئے بیانیے تشکیل دیے جارہے ہیں اور اس مبہم صورت حال کے ساتھ ہم آہنگی کی نئی صورتیں پیدا کی جارہی ہیں۔ اکیسویں صدی کے ڈرامائی ظہور کے بعد یہ دیومالائی قصے، کہانیاں، واہموں کی بجائے حقیقت کی غمازی کرنے کے قابل ہو گئی ہیں اور ماہرانہ استعداد کے ساتھ اس غیر یقینی اور پل پل بدلتی صورت حال کا سامنا کرنے لگی ہیں

جو معاصر منظر نامے کی دین ہے۔ معاصر عہد بہ ذات خود ایک اسطورہ ہے جس کی تیز رفتار سفاکیت پر تاحال غیر معمولی انسانی دانش یقین نہیں کر سکی۔ چناں چہ بلوچستان، اکیسویں صدی کے مضمرات، موجودہ ٹیکنالوجیکل عہد تک انسان کا ذہنی و تہذیبی ارتقا اور اس تیز رفتار عہد میں اپنے وجود کی شناخت اور اپنے ہونے کے جواز کی تلاش، یہ سب معاصر نظم کا اہم موضوعی دائرہ بنتے ہیں۔ بلوچستانی کے نظم گو شعرا نے اپنی پُر زور متخیلہ کے زیر اثر اس عہد کی تصویر کشی کرنے کے نت نئے روپ تراشنے اور نت نئی اساطیر خلق کرنے کی عمدہ کاوشیں پیش کی ہیں نیز معاصر بلوچستانی نظم اپنی منفرد فضا، علامات اور امیجز کے اعتبار سے مجموعی عصری اردو نظم کا بھی ایک منفرد حوالہ بن رہی ہے۔ ان اوصاف کی روشنی میں یہاں کی نظم کے روشن مستقبل کی پیشن گوئی کی جاسکتی ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ سہیل احمد خان، مجموعہ سہیل احمد خان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹، ص ۲۱۷

۲۔ قاضی عابد، ڈاکٹر، اردو افسانہ اور اساطیر، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۶۴-۶۵

۳۔ ذکا الدین شایان "جدید اردو نظم میں علامتوں کا استعمال، مشمولہ، اردو نظم ہیئت و اور تکنیک، مرتب، خوشحال ناظر، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۸، ص ۱۴۳-۱۴۴

۴۔ علی عباس جلال پوری، روایاتِ تمدنِ قدیم، تخلیقات، لاہور، بار سوم، ۲۰۰۲ء، ص ۱۷-۲۲

۵۔ فہیم اعظمی، آرا، مکتبۂ صریر، کراچی، ۱۹۹۲، ص ۱۱۷

۶۔ صادق مری، کاریزوں میں بہتا پانی، مہر در ریسرچ اینڈ پبلی کیشن، کوئٹہ، ۲۰۲۳ء، ص ۱۳۶-۱۳۷

۷۔ منیر مومن، گمشدہ سمندر کی آواز، مترجم، احسان اصغر، عکس پبلی کیشن، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص ۵۶-۵۷

۸۔ عدن عدیم، لفظ مقدس ہوتے ہیں، الحمد پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۱۳۱-۱۳۶

۹۔ دانیال طریر، معنی فانی، مہر در انسٹیٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ پبلیکیشن، کوئٹہ، ۲۰۱۲ء، ص ۳۲

۱۰۔ عین سلام، گہر گہر ستارگی، قلات پبلشرز، کوئٹہ، ۲۰۱۱ء، ص ۲۲۲

۱۱۔ غنی پہوال، سانسوں کی کشتیاں، رنگِ ادب پبلی کیشن، کراچی، ۲۰۱۹ء، ص ۳۷

۱۲۔ تمثیل حفصہ، فرعون زندہ ہیں (نظم)، مطبوعہ: سنگت (ماہنامہ)، جلد ۱۲، شمارہ ۳، فروری ۲۰۱۸ء، ص ۴۸

۱۳۔ بیرم غوری، نجمِ تمہیدِ شب، گوہر گھر پبلی کیشنز، کوئٹہ، ۲۰۲۳ء، ص ۱۰۴-۱۰۵

۱۴۔ احمد شہریار، اک قدم اور، کولاج پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۳ء، ص ۵۵-۵۶

۱۵۔ عمران ثاقب، چپ کی چاپ، مہر در انسٹیٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ پبلیکیشن، کوئٹہ، ۲۰۱۳ء، ص ۱۰۱

۱۶۔ نوشین قمبرانی، The Axiom of Infinity (نظم)، مطبوعہ: سنگت (ماہنامہ)، جلد ۲۰، شمارہ ۱۱، اکتوبر ۲۰۱۷ء، ص بیک ٹائٹل

۱۷۔ عتیق اللہ، "آرکی ٹائپ: تصور اور تنقید"، مشمولہ، تنقید کی جمالیات، جلد ۸، مرتب، پروفیسر عتیق اللہ، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۱۸۳

References in Roman Script:

1. Suhail Ahmad Khan, Majmooa Suhail Ahmad Khan, Sang E Meel Publications, Lahore,P. 217
2. Qaazi Abid, Doctor, Urdu afsana or isateer, Mujals Tarqi Adab, Lahor 2009, P. 64-65
3. Zakka Udin Shayaan, Jadid Urdu Nazm Mian Alamaton Ka Istemal, Mashmola, Urdu Nazm Hait aur Technique,Muratab, Khushal Nazir, Misal Publisher, Faisalabad, 2018,P. 143-144
4. Ali Abbas Jalal Puri, Riwayat E Tamadun E Qadeem, Takhleeqat, Lahore, Third Addition, 2002, P. 17- 22
5. Faheem Azmi, Aara, Maktaba E Sarir, Karachi, 1992, P. 119.
6. Sadiq Marri, Karezoon Main Bahta Pani, Mahr dar Research and Publication, Quetta, 2023, P. 136- 137
7. Muneer Momoin, Gumshda Samandar ki Aawaaz, Tarjuma, Ahsan Asghar, Aks Publication, Lahore, 2020, P. 57-58
8. Adan Adeem, Lafz Muqadas hotay hain, Alhamd Publications, Lahore, 2006, P. 131-136
9. Danial Tareer, Mani Fani, Maher dar institute of research and Publication, Quetta, 2012. P. 32.
10. Ain Salam, Guher Guher Sitaragi, Qalat Publisher, Quetta, 2011, P. 222.
11. Ghani Pahwal, Sanson ki kashtiyan, Rang e adab Publication, Karachi, 2019, P. 37
12. Tamseel Hafsa, Faraon Zinda hain (nazm), Matabua: Sangat (Mahnama), Jild 21, Shumara 3, February 2018, P. 48.
13. Beram Ghauri,Najm E Tamheed E Shab, Gauher Ghar Publications, Quetta, 2023, P. 104-105
14. Ahmad Sheheryar, Ik Qadam Aur, Collage Publications, Lahore, 2023, P. 55-56
15. Imran Saqib,Chup ki Chap, Maher dar institute of research anf publication,Quetta,2013,P. 101
16. Nausheen Qambarani, The Axiom of Infinity (Nazm) , Matbua, Sangat, Jild 20, Shumara 11,October 2017, P. Back Title.
17. Attiq Ullah,Aarki Type: Tasawur awr Tanqeed,Mashmola,Tanqeed ki jamaliyat (Jild: 8), Muratab, Professor Attiq Ullah, Fiction House, Lahore, 2018, P. 183

Dr. Qandeel Bader is an Assistant Professor in the Department of Urdu at Sardar Bahadur Khan Women's University, Quetta, Pakistan. She completed her Ph.D. in Urdu from the National University of Modern Languages, Islamabad, with a focus on Poetry and Criticism. Dr. Bader has authored 14 research articles and one poetry book, and she received the prestigious Allama Iqbal Adabi Award in 2022. Her research interests center on poetic expressions in contemporary Urdu literature. Additionally, she holds the position of Chairperson of the Department of Urdu at Sardar Bahadur Khan Women's University, Quetta.

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلہ
دریافت

Received: 22nd Aug, 2024 | Accepted: 15th Dec, 2024 | Available Online: 31st Dec, 2024
Digital Object Identifier: 10.52015/daryaft.v16i02.397

عاصم بٹ کے ناول " دائرہ " میں شناخت کا مسئلہ

The Problem of Identity in Asim Butt's Novel "Daira"

SAEEDA IRUM[1] AND DR. NAHEED QAMAR[2]
[1] Research Scholar Ph.D. Urdu, Federal Urdu University, Islamabad, Pakistan
[2] Associate Professor, Federal Urdu University, Islamabad, Pakistan
Corresponding Author: Saeeda Irum (oogloocreative@gmail.com)

ABSTRACT Asim Butt is one of the finest fiction writers of 21st century. The realistic topics and unique style of his writings not only fascinate the readers but also gives him a distinctive place among the other fiction writers of his time. Asim Butt deeply feels the pains and suffering of the modern person, who lost his roots and facing the issues of identity, loneliness and desolation in his inner world. His first novel "Daira" is one of the examples of his thoughts which depicts the miseries of the modern person who is in search of his identity and facing crises in his inner world.
Key words: Novel ,daira, Identity, loneliness, Desolation, Miserires,Crises

شناخت کسی بھی انسان کی انفرادی اور اجتماعی شخصیت کی وہ منفرد خصوصیات ہیں جو ہمیں دوسروں سے ممتاز کرتے ہوئے اس وسیع تر کائنات میں ایک الگ اور منفرد تشخص اور حیثیت عطا کرتی ہے۔ یہ ایک پیچیدہ اور کثیر جہتی تصور ہے کیونکہ ہر فرد یا معاشرہ بیک وقت ذاتی، سماجی، ثقافتی، تہذیبی، مذہبی، تاریخی، جنسی، پیشہ وارانہ، نفسیاتی، قومی اور جغرافیائی شخصیت، زبان، اقدار، عقائد اور تجربات رکھتا ہے اور یہی تمام عوامل مل کر اس کی شناخت کی تشکیل کرتے ہیں۔

بیسویں صدی اپنے ساتھ بہت سی ترقی کے ساتھ انسانی ارزانی، بے توقیری اور وحشت کا تحفہ بھی لائی، اس صدی میں ہونے والے متنوع واقعات مثلاً پہلی اور دوسری جنگ عظیم، انقلاب روس، نو آبادیات، جنگیں، ہجرتیں اور ان سب کے دوران ہونے والے خون ریز واقعات نے انسانی عظمت اور اخلاقیات و اقدار کے تصورات کو چکنا چور کر دیا، انسانی بے حسی، سیاسی رسہ کشی، موت کی ارزانی، جبر و استبداد، روحانی و اخلاقی اقدار کے زوال، سوشلزم، مارکسزم اور کیپیٹل ازم جیسی تحریکیں، مشین کی ترقی، سرمایہ دارانہ نظام کا فروغ، گلوبلائزیشن، سائنس اور مواصلات کی ترقی اور صنعتی ترقی کے نتیجے میں جنم لینے والے میکانکی اور خود غرض رویوں نے انسان کو مشین بناتے ہوئے اسے سماج سے کٹ کر بے روح، خود غرض اور تنہا زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا۔ سرمایہ دارانہ نظام نے روحانیت، مذہب، اخلاقیات اور اجتماعیت جیسے تصورات کو ٹھیس پہنچائی تو انسان کا آخری جذباتی و روحانی سہارا بھی جاتا رہا اور وہ اپنی ہی ذات تک محدود ہو کر رہ گیا، جس کے نتیجے میں خارج کے ساتھ ساتھ اس کی داخلی شخصیت بھی گمبھیر مسائل کا شکار ہو گئی۔ ایک حد پر جا کر اسی مایوسی، تنہائی، عدم تحفظ اور بے یقینی کے شکار فرد نے سماجی پابندیوں سے بغاوت کا رویہ اختیار کر لیا جس کی ایک مثال یورپ جیسے ترقی یافتہ معاشرے

This work is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلہ
دریافت

میں ہپی ازم اور لادینیت کی صورت میں ہمارے سامنے آئی لیکن یہاں ایک سوال اور کھڑا ہوا کہ اگر اپنی ساری بنیادوں، اپنی جڑوں سے ہی انکار کر دیا جائے تو فرد اور معاشرے کی شناخت کیا ہو گی؟

شناخت کی تعریف پر نظر ڈالیں تو فرہنگ آصفیہ کے مطابق شناخت کے معنی:

"تمیز، پہچان، آگاہی، واقفیت، شناسائی کے ہیں"(۱)

کیمبرج ڈکشنری کے مطابق:

" The term identity refers to the quality that makes a person, organization different from others" (۲)

جبکہ انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا کے مطابق:

" Identity is the qualities, beliefs, etc. That makes a particular person or group different from others" (۳)

یعنی مجموعی طور پر شناخت وہ خصوصیت یا انفرادیت ہے جو ایک شخص، معاشرے، تہذیب، قوم یا تنظیم کو دیگر سے مختلف کرتی ہیں اور اگر ہم اس شناخت سے محروم ہو جائیں تو ہمارا وجود اور حیثیت ہی ختم ہو جاتی ہیں۔

ادب معاشرے کا وہ آئینہ ہے، جس میں ہم اپنی سیاسی و سماجی، اخلاقی و نفسیاتی زندگی اور رویوں کی اصل تصویر دیکھ سکتے ہیں جبکہ ادیب وہ حساس اور ذمہ دار ہستی ہے جو سماج میں ہونے والی تبدیلیوں اور مسائل کو اپنی تحریروں کے ذریعے ہمارے سامنے پیش کرتا ہے ۔مابعد جدید دنیا کی حسیت، ژولیدگی، بے بسی اور بے حسی سے جنم لینے والی صورتحال نے آنے والی نسلوں میں حیات و کائنات کی حقیقت اور اپنے وجود کے تشخص کے حوالے سے ذہنی اور جذباتی تشکیک، خلفشار اور بے چینی کو فروغ دیتے ہوئے انسان کو شناخت کے المیے سے دوچار کیا تو اس عہد کے ادیب نے بھی اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے بدلتی ہوئی عالمی صورت حال اور اس سے پیدا ہونے والے انفرادی اور اجتماعی مسائل کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔انہی مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ شناخت کا ہے جس نے انفرادی اور اجتماعی دونوں حوالوں سے انسان کو متاثر کیا اور آج دنیا بھر کے بڑے ادیبوں کے یہاں ہمیں شناخت سے متعلقہ مسائل کے مباحث بڑی وضاحت سے نظر آتے ہیں۔

برصغیر کے حوالے سے بات کی جائے تو ان تمام عوامل کے علاوہ مابعد جدید صورت حال، کلونیل ازم، تحریک پاکستان، تقسیم اور پاکستان کی تشکیل کے بعد جنگوں، مارشل لاء، مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور دیگر مذہبی، لسانی، سیاسی و معاشرتی عوامل نے یہاں شناخت کے حوالے سے بہت سے سوالات کو جنم دیا۔ متحدہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان کی شناخت رکھنے والے تقسیم کے بعد پاکستانی اور ہندوستانی کے خانوں میں بٹے اور ابھی اس حادثے سے سنبھلے نا تھے کہ پاکستانی اور بنگالی کے خانوں میں بٹ گئے اور شناخت در شناخت کا یہ سفر کبھی لسانی کبھی مذہبی اور کبھی سیاسی و معاشرتی شناخت پر سوال اٹھا کر فرد اور معاشرے دونوں کے لیے زہر قاتل ثابت ہوا۔

"اس خطے کے لوگ ہندوستانی یا ہندی کہلاتے تھے لیکن ان کی قومیت کو از سر نو تشکیل دیا گیا اور وہ راتوں رات پاکستانی ہو گئے" (۴)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

قیام پاکستان کے بعد ہم جن فکری، نظریاتی، جذباتی اور شناختی مسائل کا شکار رہے انکے باعث دانستہ یا نادانستہ طور پر شناخت اور اس سے متعلقہ مسائل ہمارے ادب کا حصہ بن گئے۔ ان ادیبوں میں ایک اہم اور معتبر نام عاصم بٹ کا ہے جن کی تحریروں کا ایک اہم موضوع انسان کی شناخت، اس کے وجود کی تلاش، جدید انسان کی داخلی و خارجی کیفیات، نفسیات کا الجھاؤ، جذباتی مسائل اور جدید دور میں شناخت کے حوالے سے عدم تحفظ کا احساس ہے جس نے انسان کے وجود اور شناخت کو ایک سوالیہ نشان بنا دیا ہے۔

عاصم بٹ اکیسویں صدی کے نمائندہ اور کثیر الجہت تخلیق کار ہیں جو بیک وقت بطور مترجم، محقق، نقاد اور فکشن نگار اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے ہیں لیکن ان کا اصل میدان فکشن ہے جس میں انہوں نے جدید انسان کی نفسیاتی و جذباتی کشمکش اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل کو ایک انوکھے اور دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔

> "عاصم بٹ دور حاضر کے ایک معروف فکشن نگار ہیں۔ ان کی پہچان ایک جدید حسیت کے حامل فکشن رائٹر کے طور پر مسلم ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ان کی تحریروں میں عام انسانوں کی زندگی اپنی ایک خاص معنویت کے ساتھ کئی جہتوں میں وقوع پذیر ہوتی ہے اور فرد کے باطن کی عمدہ تصویر کشی دیکھنے کو ملتی ہے"(۵)

ان کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جو انسان کے جسم و جاں کو چاٹتی ان حقیقتوں اور مسائل کی نشاندہی کرتے ہیں جو بظاہر مکمل نظر آنے والے انسان کے داخل کو دیمک کی طرح چمٹے انہیں کھوکھلا کرتے ہیں۔ انسان کی ظاہری اور باطنی الجھنیں، جذبات و احساسات اور اس کے نفسیاتی مسائل عاصم بٹ کا خاص موضوع ہیں وہ خارج سے زیادہ باطنی تلاطم پر نظر رکھتے ہیں۔ وہ ایک غیر معمولی ادیب ہیں اسی لیے ان کے موضوعات، انداز اور کردار بھی انوکھے اور چونکا دینے والے ہوتے ہیں، ان کی تحریریں یکدم نہیں کھلتی بلکہ ہر قدم پر ایک نیا موڑ لے کر قاری کو اپنی سحر سے نکلنے کا موقع نہیں دیتیں۔ عاصم بٹ کی تحریروں کے متعلق ڈاکٹر رشید امجد کا کہنا ہے:

> "عاصم بٹ اس نسل کا نمائندہ ہے چناں چہ جب وہ اپنے آس پاس پر غور کرتا ہے تو اس کے نتائج اور رویے پرانے فکری رویوں اور نتائج سے مختلف ہوتے ہیں۔ ہونا بھی چاہیے، اس نے اپنے مختلف رویوں پر اپنی کہانیوں کی عمارت استوار کی ہے اور یہی اس کی کہانیوں کی جدت اور انفرادیت ہے"(۶)

عاصم بٹ نے اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی دور میں ہی کافکا کو ترجمہ کیا شاید اسی لیے اکثر ناقدین کے مطابق ان کی تحریروں میں کافکا کے فکری، اسلوبیاتی اور وجودی تصورات کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔ جس ادھورے پن، تشکیک، بیگانگی، لایعنیت، اضطراب، تنہائی اور اجنبیت کی کیفیت ہمیں کافکا کے یہاں ملتی ہے اسی کی جھلک ہمیں عاصم بٹ کی تحریروں میں بھی نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں فرد کی ذات اور شناخت کے حوالے سے مسائل بڑی وضاحت سے ابھر کر سامنے آتے دکھائی دیتے ہیں، ان کے کردار اپنی ذات کی شناخت اور وجود کے حوالے سے عدم تکمیلیت اور اضطراب کا شکار نظر آتے ہیں جو جدید انسان کا ایک بڑا اور اہم ترین مسئلہ

ہے۔ حقیقت سے اتنی جڑت ہی کے نتیجے میں ان کے کردار کسی داستان یا افسانے کے کردار محسوس نہیں ہوتے بلکہ وہ ہمیں اپنے ارد گرد زندہ سانس لیتے محسوس ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے عاصم بٹ کا کہنا ہے کہ:

"میرے لئے سب سے اہم معاملہ کردار کے اندر چل رہا ڈائلمہ یا کش مکش ہے۔ اکثر ہم جو بھی کچھ کر یا کہہ رہے ہوتے ہیں وہ سو فیصد وہ نہیں ہوتا جو کہ ہمارے اندر چل رہا ہوتا ہے اور اس حقیقت کو اکثر اوقات ہم خود بھی نہیں جان پاتے۔ میرے لئے سب سے محبوب موضوع ہے کہ میں اس کشمکش، اس ڈائلمہ کو پینٹ کروں۔ ہر انسان کا ایک ظاہری اور ایک نفسیاتی کردار ہے اور ان دونوں کے درمیان بہت بُعد، بہت فرق ہوتا ہے۔ جیسے کسی وقت آپ چاہ کچھ اور رہے ہیں، کہنا کچھ چاہتے ہیں لیکن اس کے بالکل متضاد کہنے یا کرنے پر مجبور ہیں۔ ظاہر اور باطن کا یہ تضاد بظاہر شاید بلکل سادہ بات ہے لیکن اس میں بہت پیچیدگی ہے۔ یہی تضادات ہمارے داخل میں اضطراب اور کشمکش کا باعث بنتے ہیں جس سے زندگی میں ایلینیشن (بیگانگی)، بیزاریت اور بے معنویت پیدا ہوتی ہیں اور یہ شہری زندگی میں زیادہ طاقت کے ساتھ ہم پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید دور کے شہری انسان کے ہاں یہ مسائل بہت زیادہ ہیں۔ میرا بنیادی موضوع جدید انسان کے یہی وجودیاتی مسائل اور اس کا کرب ہے جو اس ایلینیشن، بے معنویت اور لایعنیت کا پیدا کردہ ہے۔" (۷)

عاصم بٹ کے پہلے ناول "دائرہ" میں انہوں نے جدید ہنگامہ خیز زندگی میں الجھے اس انسان کی تصویر کشی کی ہے جو اپنی شناخت کے حوالے سے تشکیک کا شکار ہو کر دائروں میں بھٹک رہا ہے۔ ان دائروں میں بھٹکتے ہوئے وہ بارہا اپنی ذات اور اپنی شناخت کے قریب سے اجنبی بن کر گزر جاتا ہے اور کہیں وہ خود سے پرے کھڑا خود کا پتا معلوم کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس ناول میں انہوں نے انسانی تشخص کے المیے اور اس معاشرے میں سانس لیتے عام فرد کے معاشی، اخلاقی، سماجی نفسیاتی اور جذباتی مسائل کو بڑی فنکاری اور بہت ہی منفرد انداز میں اجاگر کیا ہے۔

اس کہانی کا مرکزی کردار راشد دور حاضر کی پر آشوب زندگی میں ذہنی و جذباتی پراگندگی اور وجودی کرب کا شکار ایک ایسا کردار ہے جو پیشے کے لحاظ سے فلم ایکٹر ہے لیکن اس کا ذہن، ذات اور زندگی اپنے کرداروں اور حقیقی زندگی دائروں میں الجھ کر اپنی شناخت ہی کھو چکے ہیں۔ اس ناول میں دور جدید کے اس انسان کا مسئلہ اٹھایا ہے جو کئی چہروں اور دائروں میں زندگی بسر کرتے کرتے داخلی کرب، تنہائی، مایوسی، بے گانگی، لایعنیت، تشکیک اور بے چینی کا شکار ہے۔ وہ اپنی مرضی اور انتخاب کے بنا سماج کے مسلط کردہ دائروں میں جینے اور اپنی ذات پر ایک خول چڑھا کر دوہری زندگی گزارنے پر مجبور ہے اور کوشش کے باوجود ان مسلط کردہ دائروں سے چھٹکارا پانے میں ناکام رہتا ہے۔ اسی دائروی حرکت اور پابندی کے باعث فرد کے اندر اکتاہٹ اور بے چارگی کا سفر شروع ہوتا ہے اور

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

ایک ایسی بے بس، مجبور اور سسکتی زندگی ہمارے سامنے رونما ہوتی ہے جس کی کوئی ابتدا ہے اور نہ انتہا۔ یہ ایک ایسا تسلسل ہے جو دائرے کی طرح جاری و ساری ہے۔ اس کردار کے آئینے میں ہم سب ہی کہیں نا کہیں اپنی ذات کا عکس محسوس کرتے ہیں کیونکہ آج کے دور کا ہر انسان کردار در کردار بٹ کر اپنی شناخت اور اپنے تشخص کی تلاش میں بھٹک رہا ہے۔ عاصم بٹ اپنے اس ناول کے متعلق کہتے ہیں:

> "ہر انسان کی زندگی دراصل دائرہ در دائرہ سفر کی کہانی ہے اور دائروں کا یہ سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔اس ناول کا مرکزی خیال کری ایٹیو اوبسیشن (creative obsession) کا شکار ایسا فرد ہے جو اپنے داخل اور خارج کے دائروں میں الجھ کر اپنی شناخت اور اپنے وجود کے حوالے سے تشکیک کا شکار ہو چکا ہے۔ ہم اپنی زندگی میں جتنے بھی کردار ادا کرتے ہیں یہ ملٹی فیسڈ(multi faced)ہوتے ہیں ، ان کی متنوع صورتیں اور رخ ہوتے ہیں جنہیں ہم طے نہیں کرتے لیکن یہ ہمارے وجود اور شناخت کو حصوں میں بانٹ دیتے ہیں لیکن ان سب صورتوں کو طے کرنے والا کون ہے ؟ کیا یہ ہمارے داخل کی کوئی طاقت ہے ؟ یا وہ مقدر جسے ہمارے لیے لکھا گیا ہے ؟ یہی سوال اور الجھن آج کے انسان کا سب سے بڑا مسئلہ اور اس ناول کا بنیادی موضوع ہے۔" (۸)

راشد بظاہر ایک کامیاب فلم ایکٹر ہے لیکن وہ اپنی ذاتی زندگی کے اتار چڑھاؤ اور محرومیوں کے نتیجے میں نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو چکا ہے۔ ایک کامیاب اداکار کی حیثیت سے وہ اپنے تمام کرداروں میں گم ہو کر انھیں نبھاتا ہے اور بالآخر انہیں کرداروں میں اپنی شناخت کھو دیتا ہے۔ کہانی کا آغاز اس کی فلم کے آخری شاٹ سے ہوا جس میں وہ کاپی رائٹر آصف مراد کا کردار ادا کر رہا ہے لیکن فلم کے اختتام کے بعد بھی وہ اس کردار سے نکل نہیں پایا اور خود کو آصف مراد سمجھتے ہوئے اس کردار سے متعلق حوالوں اور شناخت کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ کہانی کے اختتام پر بھی وہ ایک مزدور امین گل کا کردار ادا کرتے کرتے اس کردار میں گم ہو جاتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ دراصل اس کی شناخت کیا ہے ؟ وہ راشد ہے، آصف مراد یا پھر امین گل ؟ اس تلاش میں وہ صرف اپنی ذات سے ہی نہیں بلکہ اپنی بیوی کی ذات سے بھی بیگانہ ہو کر اپنی ذات، وجود اور اصل شناخت کے حوالوں سے انکار کر کے ان کرداروں سے جڑی شناخت کی تلاش میں اپنا آپ تلاش کر رہا ہے۔ وہ اپنے کرداروں میں اپنے آپ کو ایسے ڈھال لیتا ہے کہ اُسے خود سے جدا نہیں کر پاتا۔

اپنے آپ سے انکار کر کے اپنے کردار کے وجود کو تلاش کرنے کے لیے وہ کتنے ہی دن ان گلیوں، بازاروں اور جگہوں کی خاک چھانتا ہے جہاں اس کے خیال میں آصف مراد کی حیثیت سے اس کی شناخت ممکن تھی لیکن وہاں بھی اس کو پہچاننے والا کوئی نہیں تھا جس کے بعد وہ نفسیاتی اور جذباتی حوالوں سے بھی الجھن کا شکار ہو جاتا ہے لیکن اس تمام الجھن میں نورین اس کا ساتھ دیتی اور اسے اپنے اصل کی جانب لانے کی جدوجہد کرتی دکھائی دیتی ہے۔

"کیا ہو گیا ہے تمھیں راشد؟ وہ بولی۔

میں راشد نہیں ہوں۔

تم راشد نہیں ہو۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ عورت الجھی ہوئی غم زدہ اور غصیلی آواز میں بول رہی تھی

"شاید میری صورت راشد صاحب سے ملتی ہے۔ آپ شاید راشد کی بیوی ہیں۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ بھی نہ پہچان پائیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

"اوہ ہاں۔ تو میں سمجھی، اچھا یہ بات تھی"۔ "کچھ دیر خاموش رہی تو آپ کون ہیں"

"آصف مراد"

امیجز ایڈورٹائزنگ میں کاپی رائٹر؟.

"جی آپ؟"

"میں کوئی بھی نہیں۔ ایک بیوی، عاشق، اداکارہ، اور جانے کون۔"(۹)

اس ناول میں راشد کا کردار اس دور کے ہر اس انسان کا عکاس ہے جو اپنی ذات پر خول چڑھائے ایسی مصنوعی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا ہے جو بظاہر اپنی چکا چوند سے نگاہوں کو خیرہ کرتی ہے لیکن ہمارے باطن کو کھوکھلا اور ہماری ذات کو بے جڑ کر کے ہمیں ایک ایسے بے روح معاشرے کا حصہ بنا دیتی ہے جس کی ناتو کوئی بنیاد ہے اور نا ہی جڑت۔ آج کا انسان اخلاقی، نفسیاتی اور داخلی لحاظ سے ہمیشہ بے سکون اور ادھورے پن کا شکار رہتا ہے اور یہی کشمکش ہمیں اس ناول کے تمام کرداروں میں نظر آتی ہے۔

"صوفے میں دھنسے ہوئے خود اسے بھی اپنا آپ اس دھندلے منظر کا حصہ معلوم ہوا۔ وقت کے کسی عظیم منظر میں گم ہو کر وہ بھی اپنی شناخت کھو چکا تھا۔ شاید وہ اس منظر کا حصہ ہی نہیں تھا اور غلطی سے، جس کا ذمہ دار کوئی بھی ہو سکتا ہے، اس دھندلے منظر میں آنکلا تھا محض وقت کی کسی دوسری پرت میں کسی عظیم چال ساز کے کسی طاقت ور ارادے کے تحت۔" (۱۰)

اس ناول میں پیش کیا جانے والا ایک اہم مسئلہ اپنی جڑوں سے جڑت اور جدید انسان کی ذات اور شناخت کے کھوکھلے پن کا بھی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ فرد کی شناخت اس کی جڑوں کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ شناخت جتنا مضبوط ماضی اور حوالے رکھتی ہے اس کا لڑکھڑانا اتنا ہی مشکل ہوتا ہے اب یہ حوالے چاہے ہمارے ماضی یا رشتوں کی صورت میں ہوں یا زمینی، مذہبی اور سماجی، یہ ہمیں ایک ایسی جڑت فراہم کرتے ہیں جس کے رہتے ہمارا بھٹکنا اور اتنے سارے حوالوں کا انکار کرنا ممکن نہیں رہتا۔ ہمارے معاشرتی اور جذباتی رشتے ہماری ذات اور شناخت کو ایک محور ایک مضبوط بنیاد اور حوالہ فراہم کرتے ہیں اور کسی الجھاؤ کی صورت میں کہیں نا کہیں سے تھام کر اپنے مدار پر واپس لانے میں مدد کرتے ہیں لیکن راشد ان تمام حوالوں سے محروم تھا۔ بچے کی پہلی شناخت اس کے ماں باپ کا وجود ہوتا ہے، راشد کا باپ ایک نشئی تھا جس نے کبھی اسے باپ کی شفقت اور اس رشتے کے احساس کی خوبصورتی سے روشناس نہیں کروایا جبکہ اس کی ماں ایک بے بس، مجبور اور کمزور عورت تھی جو اپنی تمام زندگی ظلم سہتی ہے لیکن اپنے بیٹے کے لیے ایک اچھے مستقبل کی

تمنائی ہے۔ وہ اس کے لیے کوشش بھی کرتی ہے لیکن اپنے نشئی شوہر اور بیماری کے ہاتھوں شکست کھا کر اسے اپنے بھائی کے حوالے کر کے دنیا سے منہ موڑ لیتی ہے۔ حالات کی سختی اور جینے کی جدوجہد نے اس عورت کو اتنا تلخ کر دیا تھا کہ وہ راشد کو اس ماتا سے روشناس نا کروا سکی جو اس کی یادوں کا حصہ بن پاتا۔ اسی لیے راشد کو نا تو باپ کا پیار ملا نا ہی ممتا جو اس کی شناخت کا حوالہ بنتی۔ ماموں نے راشد کو پناہ بھی دی اور مقدور بھر شفقت سے بھی نوازا لیکن اس کے پس پردہ بھی خود غرضی موجود تھی جس نے راشد کو وہاں سے فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔

اپنے اس ماضی، اپنی جڑوں اور وجود کے ان تینوں حوالوں سے راشد کی کوئی جذباتی وابستگی نہیں تھی اسی لیے اس کی شناخت بے جڑ اور معلق ہو کر رہ گئی اور جب وہ اپنی ذات کے بارے میں تشکیک کا شکار ہوا تو ایسا کوئی حوالہ کوئی رشتہ موجود نہیں تھا جو اسے واپس اپنے اصل کی جانب لانے میں مددگار ثابت ہو سکے۔ اسی بے جڑ، بکھری اور بے محور زندگی نے راشد کے اندر کبھی ختم نا ہونے والی بے چینی، کشمکش اور تلاش کو جنم دیا اور اسے ایک دوسرے وجود میں پناہ لینے اور شناخت کے نئے حوالے نئے پیمانے ڈھونڈنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے اپنے گرد نئے کرداروں اور نئی شناختوں کے دائرے تخلیق کیے جن میں الجھ کے وہ ان سے نکلنے کا راستہ ہی کھو بیٹھا۔
ناول کے اختتام میں راشد ہمیں ایک کان کن مزدور امین گل کا کردار ادا کرتا دکھائی دیتا ہے جسے کرتے ہوئے وہ ایک نئے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے اور راشد یا آصف مراد کے بجائے ایک نئے وجود ایک نئی شناخت 'امین گل' میں گم ہو جاتا ہے اور ایک ہذیانی کیفیت کا شکار ہو کر چلا اٹھتا ہے۔

"وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا، میں امین گل نہیں ہوں۔ میں امین گل نہیں ہوں۔ میرا یقین کرو ۔ مجھ پر رحم کرو۔ میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ میں راشد ہوں، میں آصف ہوں نہیں نہیں۔ میں آصف۔ میں راشد۔ کیمرے آف کر دو۔ لائٹ آف۔ شاٹ کینسل۔ پیک اپ پیک اپ۔ میں یہ شاٹ نہیں کروں گا۔ میں یہ کیریکٹر نہیں کروں گا۔ کوئی مجھ سے زبردستی کچھ نہیں کروا سکتا۔ مجھے اس دائرے سے نکالو۔ مجھے واپس جانے دو۔ مجھے واپس جانے دو۔" (۱۱)

یہ چیخ اور بے بسی صرف اس کردار کی نہیں بلکہ اس مصنوعی اور بے روح معاشرے میں دم گھٹتے ہر اس انسان کی چیخ ہے جو اپنے نقاب نوچ کر اپنے اصل کے ساتھ جینا چاہتا ہے لیکن ایسا نا کرنے پر مجبور ہے۔ وہ اپنی ذات پر مسلط اس گھٹن سے نجات حاصل کرنے اور شخصی آزادی کا خواہشمند تھا لیکن اس دائرے کو توڑنے اور خود کو آزاد کرنے میں نا صرف یہ کہ ناکام ٹھہرا بلکہ دائرہ در دائرہ الجھتا چلا گیا۔ شاید اسی بے بسی اور جھنجھلاہٹ نے اس کے اندر اس ردعمل کو جنم دیا جو اس کی شناخت کے الجھاؤ کی صورت میں ہمارے سامنے دکھائی دیتا ہے۔ اس کا کردار جدید انسان کی اس کشمکش، نفسیاتی الجھنوں اور بغاوت کا عکاس ہے جو سماج کے لگے بندھے اصولوں کے مطابق جینے اور اپنی ذات کا اظہار نا کر سکنے کی بدولت گھٹن اور بے بسی کا شکار ہے، وہ بے یقین ذات اور اپنے جذبات اپنے اصل کا اظہار چاہتا ہے اور ایسا نا کر سکنے کی بدولت اپنی ذات اپنی شناخت کی نفی کرنے لگا ہے۔

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

"کوئی دروازہ ہو کہ جس پر دستک دے کر اسے کھولا جاسکے۔ لیکن یہ عمارت بے در تھی۔
کوئی کھڑکی کوئی روشندان نہیں تھا، کوئی جھری نہیں تھی جس سے وہ اندر جھانک پاتا۔
ہو ابند دائرہ تھا جس میں وہ داخل نہیں ہو پارہا تھا۔" (۱۲)

راشد آج کے دور کے ان لاکھوں بے بس اور مجبور لوگوں کا نمائندہ ہے جو سماجی مسائل، معاشی پریشانیاں، معاشرتی رویے، استحصال، تنہائی اور بے بسی جیسے عوامل کے نتیجے میں جنم لینے والی فرسٹریشن اور ڈپریشن سے جنگ لڑتے لڑتے اپنی ہی ذات کے ظاہر اور باطن میں الجھ کر رہ گیا ہے جس کے نتیجے میں اس کی اپنی ذات اور شناخت اس کے لیے ایک ایسا جگسا پزل (jigsaw puzzle) بن چکی ہے جسے سلجھانے کی کوشش میں وہ مزید الجھ کر رہ گیا ہے اور بالآخر فرار کے لیے اپنی ہی ذات کے خول میں قید ہو کر رہ گیا ہے۔ راشد کی زندگی کی محرومیاں، مسخ شدہ بچپن، الجھے ہوئے اور خود غرض رشتے، ناآسودہ تمنائیں، بے بسی اور تنہائی اس کے باطن میں ایک ایسا شور برپا کر دیتے ہیں جس سے بچنے کے لیے دوہری اور منافقانہ زندگی جینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی ماضی اور شناخت سے اپنا دامن بچانے کے لیے وہ کبھی آصف مراد کے کردار میں پناہ ڈھونڈتا ہے تو کبھی امین گل کی صورت میں اپنی شناخت تلاش کرتا ہے۔ یہ سارے کردار اس کی شناخت کے دائرے ہیں جن میں اپنا آپ ڈھونڈنے کی کوشش میں اس کی ذات دائرہ در دائرہ الجھتی چلی جاتی ہے۔

"اس نے خود کو ایسے لوگوں میں گھرا ہوا پایا جو اسے ایک نئے نام اور کردار سے جانتے تھے، اور وہ مخمصے میں مبتلا ہو گیا کہ کیا یہ لوگ کسی غلط فہمی کا شکار تھے۔ یا خرابی خود اس کے ہی سمجھنے اور جاننے میں کہیں تھی۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ شخص جو آصف تھا یا راشد یا کوئی تیسرا، چوتھا، پانچواں یا چھٹا فرد، اس نئی زندگی سے نئے سرے سے یوں گہری موافقت قائم کر چکا تھا کہ اب وہ خود بھی اس بات کو شک کی نگاہ سے دیکھتا کہ کیا واقعی وہ کبھی اس طرز زندگی سے جدا کوئی زندگی گذار تا رہا تھا؟ کیا واقعی وہ اپنے اس موجود کردار سے ہٹ کر بھی بھی کسی دوسرے کردار کی صورت میں زندہ رہا تھا" (۱۳)

راشد کا کردار وقت اور سماج کی جبریت کے تحت جنم لینے والا ایسا المیہ ہے جو اپنی نفسیاتی الجھنوں کے نتیجے میں اصل اور وہم کے درمیان الجھ کر اپنی شناخت کھو چکا ہے۔ اب وہ اپنے اصل کو وہم مانتا ہے اور وہم کو اصل مان کر اس کی تلاش میں سرگرداں ہے جس میں ناکام ہونے پر وہ صرف اپنے وجود اور اپنی شناخت سے ہی انکار نہیں کرتا بلکہ اپنے سے جڑے دوسرے رشتوں کی شناخت، اپنے ماضی اور دیگر حوالوں سے بھی گریزاں ہے اور آصف مراد کے کردار میں گم ہو کر اپنے تصورات کی دنیا کو ہی حقیقت مان کر اپنی حقیقت سے منکر ہے لیکن جب اس حوالے سے بھی اپنی تلاش میں ناکام رہتا ہے تب اس کی الجھن سے شناخت کا وہ المیہ جنم لیتا ہے جو راشد کے کردار میں ایک الگ طرح کی وحشت، المیے اور بے بسی کو جنم دیتا ہے۔ وہ ایک حساس انسان ہے جو داخلی اور خارجی دونوں حوالوں سے اس

وقت اور سماج میں ان فٹ ہے شاید اسی لیے وہ داخلی جبریت کا شکار ہے اور اپنا وجود تلاشتا بھٹک رہا ہے، اس تلاش نے اسے صرف اس کی ذات سے ہی نہیں بلکہ اس سے وابستہ دوسرے لوگوں سے بھی بیگانہ کر دیا ہے۔

> "اگر وہ سب کچھ جو اس کے خیال میں یہیں کہیں تھا محض التباس تھا تو پھر انہی کا ایک حصہ، انہی میں شامل ایک جزو، یعنی وہ خود بھی کیا التباس سے زیادہ کچھ ہے؟ تو اس کی کیا حقیقت ہے؟ محض ایک خواب کا کردار یا؟۔" (۱۴)

ڈاکٹر ممتاز احمد کے مطابق:

> "نورین اس کی بیوی ہے لیکن وہ اس کردار کے بارے میں تشکیک کا شکار ہے یہ ہی شک ایک عفریت کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کے نتیجے میں اس کی خانگی زندگی شکست و ریخت کا شکار ہونے لگتی ہے اور یہ نفسیاتی عارضہ اسے ذاتی تشخص کی گمشدگی کے مین ہول میں دھکیل دیتا ہے۔" (۱۵)

راشد کے کردار کے علاوہ اس کہانی کا دوسرا اہم کردار اس ناول کی ہیروئین اور راشد کی بیوی نورین ہے جو راشد ہی کی طرح ایک اداکارہ ہے اور زندگی کے بہت سے اتار چڑھاؤ اور سماج کے بہت سے رویوں کو سہتی اس مقام تک پہنچی ہے لیکن کہیں نا کہیں وہ بھی شناخت کے اسی المیے کا شکار ہے جو اس دور کے ہر انسان کی زندگی کا حصہ بن چکا ہے۔

> "اسے یہ سب کچھ بہت بے معنی معلوم ہوا۔ آصف مراد اور زرینہ اور وہ خود ...
> سکرپٹ میں لکھے ہوئے کردار۔ ایک ہی پل میں
> کئی کئی زندگیاں جیتے ہوئے کردار۔ اور وہ خود کیا تھی؟ نورین یا زرینہ، یا بیک وقت کوئی ایسی تیسری ہستی جو ان دونوں کرداروں سے جدا بھی تھی اور ان میں شامل بھی" (۱۶)

نورین کا کردار اس سماج کا وہ چہرہ سامنے لاتا ہے جو عورت کی حیثیت کو قبول کرنے سے انکاری ہے۔ اس کی صنفی شناخت اس کے وجود کو اس کے اپنے باپ کے لیے ناقابلِ قبول بنا دیتی ہے۔ اس کے باپ ملک خداداد نے پہلی بیوی سے دو بیٹیاں پیدا ہونے پر بیٹے کے لیے دوسری شادی کر لی۔ ملک خداداد کا یہ رویہ ہمارے معاشرے کی اس پچھڑی ہوئی سوچ کا عکاس ہے جہاں بیٹے ہی کو اپنی نسل کا امین اور اپنی شناخت کا محافظ مانا جاتا ہے اور بیٹیوں کو پرایا دھن کہ کر ہر جگہ بیٹوں کو ان پر فوقیت دی جاتی ہے۔ مرد تو ایک طرف ماں خود عورت ہونے کے باوجود بیٹوں کی ماں ہونے پر جو فخر محسوس کرتی ہے وہ بیٹیوں کے وجود پر نہیں کیا جاتا جس کے نتیجے میں عورت ہمیشہ دوسرے درجے کی مخلوق کی طرح ٹریٹ کی جاتی ہے۔ نورین کی بہن کی شادی بھی اس نے ایک ایسے انسان سے کی جو صرف بیٹے کی خواہش میں تیسری شادی کر رہا تھا اور جب یہ بیوی بھی اس کی خواہش پورا کرنے میں ناکام رہی تو اسے طلاق دے دی جس کے بعد ماں نے نورین کو بچانے کے لیے اپنے کے بھائی کے پاس شہر بھیج دیا جس کی بدولت وہ اس نظام سے نکل کر اپنی شناخت بنانے میں کامیاب ہو سکی۔

"وہ ان ہی لوگوں میں سے تھی لیکن ان جیسی ہونے سے اس نے خود کو بچالیا تھا۔ وہ ان کے اجتماعی مقدر کا حصہ نہیں بنی تھی۔۔۔۔۔۔اس کی طاقت تھی تو محض اتنی کہ ایک خواہش تھی کھلی فضاؤں میں اڑنے کی، ان زنجیروں کو توڑنے کی جن میں وہ وقت کے جبر کے تحت پابند تھی۔ لیکن محض خواہش کیا ہے؟۔۔۔۔۔شاید اس کی خواہش کے احترام میں اس کے حق میں فیصلہ دیا گیا تھا یا پھر وہ اتفاق سے پہلے سے بنائے گئے کسی پالیسی فریم میں فٹ آگئی تھی محض اتفاق سے۔" (۱۷)

عاصم بٹ نے اس ناول میں خواتین کے کرداروں کی صورت میں معاشرے کی دیمک زدہ سوچ کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ راشد کی ماں ہو یا نورین کی ماں اور بہن یا پھر جسم فروش زیتون بیگم یہ تمام عورتیں سماج کی اس سوچ کی عکاس ہیں جہاں عورت کا وجود اور تشخص کوئی معنی نہیں رکھتا۔ انہیں ان کی صنفی شناخت کی بنا پر انہیں نا صرف یہ کہ رد کیا جاتا ہے بلکہ انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ اسی ماحول سے جنم لینے والا نورین کا کردار اگر اپنی شناخت کے حوالے سے مسائل کا شکار ہے تو یہ کوئی ایسی اچھنبے کی بات بھی نہیں۔

"کبھی کبھار عام حقیقی صورت حال اسے فلم کے کسی سیٹ ہی کی مانند لگتی۔ جیسے ابھی کہیں سے آواز آئے گی، کٹ۔ اور یہ سین جسے وہ اپنی زندگی سمجھ کر بسر کر رہی ہے، یکبارگی ختم ہو جائے گا۔" (۱۸)

ایک مشکل زندگی گزار کر نورین راشد کے ساتھ رشتہ ازدواج میں بندھ گئی اور ایک کامیاب فلم ایکٹرس بھی بن گئی لیکن یہاں بھی اسے ہر قدم پر اپنی شناخت کے حوالے سے جنگ لڑنی پڑی۔ ہر بار جب راشد اپنے کردار میں گم ہو کر اپنا وجود فراموش کر تا تو ساتھ ہی وہ نورین کے وجود اور اس کی بیوی کی حیثیت سے بھی انکاری ہو جاتا اور ہر بار نورین کو نئے سرے سے اپنے وجود کی شناخت کروانی پڑتی۔ اس موقع پر وہ ایک دوست اور ماں کی طرح راشد کے ساتھ اس کی تلاش میں بھٹکتی، کبھی وہ آصف مراد کے فرضی گھر لے کر جاتی اور کبھی ان گلیوں بازاروں میں لیے گھومتی جہاں راشد کے خیال میں اسے اس کی شناخت مل سکتی تھی، اس تمام عمل میں وہ شوہر کی بے اعتنائی بھی سہتی رہی۔

راشد اور نورین کی طرح اس ناول کے باقی کردار بھی اپنی اپنی جگہ شناخت کے مسئلے سے الجھے ہوئے ہیں اور اپنے تشخص کی جنگ لڑنے میں مصروف ہیں۔ ناول کی ابتدا میں نظاہر ایک غیر معمولی کردار کی صورت میں سامنے آنے والی طوائف زیتون بانو بے شک کہانی میں صرف ایک جھلک دکھاتی ہے لیکن وہ شناخت کے محروم عورت کی بے بسی کی مکمل تصویر ہمارے سامنے پیش کر دیتی ہے۔

"زیتون بانو ایک عام سی مسکین، بے چاری اور بدکار عورت تھی جو کسی رومانس اور سسپنس سے بھرے ناول کی ہیروئن نہیں ہو سکتی تھی۔ اس جیسی ہر دوسری عورت کی

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

مانند اس کی زندگی بھی روز مرہ کی سفاک یکسانیت اور استحصال کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی" (۱۹)

عاصم بٹ کی کہانیوں کی ایک انفرادیت ان کے یہاں انسان کی مکمل شخصیت کا اظہار ہے وہ انسان کی ظاہری اور باطنی دونوں دنیاؤں اور ان کی کشمکش کو اپنی کہانیوں میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ انسان صرف ایک چلتی پھرتی، سانس لیتی مشین نہیں ہے بلکہ اس کی جذباتی اور روحانی ذات کا وجود بھی اتنا ہی اہمیت کا حامل ہے بلکہ شاید وہی انسان کا اصل ہے جس کی ٹوٹ پھوٹ اور الجھاؤ اس انسان کی ذات کے ساتھ ساتھ اس کے ارد گرد کی پوری فضا اور لوگوں کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں فرد کی انفرادیت کے حوالے سے شناخت کے مختلف عوامل بھی پوری وضاحت سے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر ارشد معراج کے مطابق:

"دائرہ کے کردار فرد سے افراد اور افراد سے معاشرے اور معاشرے سے نظام کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں، دائرہ پاکستانی معاشرے کی پر پیچ تہہ دار گلیوں میں پیدا ہونے والے مسائل سے پیدا ہونے والی انسانی کیفیات میں تبدیلیوں کو ظاہر کرتا ہے۔"(۲۰)

عاصم بٹ جدید انسان کی زندگی کے ان نفسیاتی، سماجی، جذباتی اور معاشی پہلوؤں کو ہمارے سامنے کھولتے ہیں جن سے کوئی بھی فرد اپنی ذات کے اندر خانے لڑتا رہتا ہے لیکن ان کا اظہار کرنے سے قاصر ہے۔ وہ زندگی کے مسائل اور ذمہ داریوں کے انبار میں گم ہو چکی نا آسودہ خواہشوں، یادوں اور ہمارے اصل چہرے سے گرد جھاڑ کر اس میں چھپے وجود کی شناخت کا سوال اٹھاتے ہیں وہ وجود جو سماج کے ڈر سے سامنے آنے سے ڈرتا ہے اور اپنے ہونے پر شرمندہ محسوس کرتا ہے۔ اس کہانی کے آغاز سے لیکر آخر تک قاری ہر کردار اور اس کی الجھنوں کے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہے۔ کہانی کی بُنت اتنی مضبوط اور جکڑ لینے والی ہے کہ آخر تک قاری خود بھی راشد اور آصف مراد کے کرداروں میں الجھ جاتا ہے اور انہیں پہچان نہیں پاتا شاید اسی لیے اس الجھن اور کرب کو محسوس کرنے میں بھی کامیاب رہتا ہے جو راشد یا آصف مراد او پھر امین گل کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ اور شاید یہ ایک مصنف کا کمال ہے کہ وہ قاری کو ان جذباتی ونفسیاتی کیفیات میں ساتھ لے کر چلے اور یقیناً عاصم بٹ نے اس حوالے سے اپنے کمال کا اعتراف کرنے پر مجبور کیا ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، جلد سوم، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۸۰

۲۔https://dictionary.cambridge.org/dictionary/english/identity

۳۔https://www.britannica.com/dictionary/identity

۴۔صفدر زیدی، مقدمہ، شناخت، فرانسز فوکویاما، مترجم، عدنان ظفر، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، ۲۰۲۳ء، ص ۰۹

۵۔ماریہ خادم، مقالہ، محمد عاصم بٹ کی فکشن نگاری، یونیورسٹی آف سرگودھا، ۲۰۱۹ء، ص ۳۸

۶۔رشید امجد، ڈاکٹر، اشتہار آدمی اور کہانیاں، مشمولہ: اوراق مدیر وزیر آغا، لاہور، سہ ماہی اوراق،، س۔ن، ص ۱۰

۷۔https://www.youtube.com/watch?v=6K8XT7pyYIE

۸۔ ایضاً

۹۔ محمد عاصم بٹ، دائرہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۷۸

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۰۰

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۵۴

۱۲۔ ایضاً، ص، ۲۱۵

۱۳۔ ایضاً، ص، ۲۴۱

۱۴۔ ایضاً، ص ۲۱۹

۱۵۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۲۳۷

۱۶۔ ایضاً، ص ۸۰

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۲۱

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۰۷

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۱

۲۰۔ کومل شہزادی، محمد عاصم بٹ کے ناولوں میں وجودیت کے اثرات، مشمولہ: متن (ششماہی تحقیقی مجلہ)، جلد ۲، شمارہ ۲، جولائی تا دسمبر ۲۰۲۱ء، ص ۱۴۱

References in Roman Script:

1. Syed Ahmed Dehlvi, Farhang-e- Aasfiya, Jild Suwwam, Urdu Science Board, Lahore, 2010, P.180
2. https://dictionary.cambridge.org/dictionary/english/identity
3. https://www.britannica.com/dictionary/identity
4. Safdar Zaidi, Muqaddama , Shanakht, Frances Foucault Yama, Mutarjam, Adnan Zafar, City Book Point, Karachi, 2023 , P.9
5. Maria Khadim, Maqala, Muhammad Asim Butt Ki Fiction Nigari, University of Sargodha, 2019 , P.38
6. Rasheed Amjad, Dr, Ishtihar Aadmi aur kahanian, Mashmolla: Auraq, Mudeer Wazeer Aagha, Lahore, Seh Mahi Auraq, Seen Noon, P.10
7. https://www.youtube.com/watch?v=6K8XT7pyYIE
8. ibid
9. Muhammad Asim Butt, Daira, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2014, P. 78
10. Ibid, P. 200
11. Ibid, P. 254
12. Ibid, P. 215
13. Ibid, P. 241

14. Ibid, P. 219
15. Mumtaz Ahmad Khan, Dr, Urdu Novel Kay Hama Geer Sarokar, Fiction House, Lahore, 2017 , P. 237
16. Ibid, P.80
17. Ibid, P. 221
18. Ibid, P.207
19. Ibid, P.211
20. Komal Shehzadi, Muhammad Asim Butt ke novels mein Wujoodiyat ke Asraat, Mashmola: Matn (Shashmaahi Tehqeeqi Majalla), Jild 2, Shumara 2, July ta December 2021, P. 141

Ms. Saeeda Irum is a Ph.D. scholar in the Department of Urdu at Federal Urdu University of Arts, Science, and Technology, Islamabad, Pakistan. She holds an M.Phil. from Allama Iqbal Open University, Pakistan, and is currently pursuing her Ph.D. in Urdu Fiction and Criticism. She has published one article. Her research interest focuses on critical perspectives in Urdu fiction.

Dr. Naheed Qamar is an Associate Professor in the Department of Urdu at Federal Urdu University of Arts, Science, and Technology, Islamabad, Pakistan. She completed her Ph.D. in Urdu from the National University of Modern Languages Islamabad, Pakistan, specializing in Urdu Fiction and Poetry. She has authored 26 articles and six books. Her current research interests include exploring new dimensions in Urdu fiction and poetry.

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

تحقیقی و تنقیدی مجلہ
دریافت

Received: 11th Aug, 2024 | Accepted: 15th Dec, 2024 | Available Online: 31st Dec, 2024
Digital Object Identifier: 10.52015/daryaft.v16i02.404

منتخب اردو فونٹس کا تکنیکی تقابل

Technical Comparison of Selected Urdu Fonts

ZAHOOR AHMED[1] And DR. RAEES AHMED MUGHAL[2]

[1] Scholar Ph.D. Urdu, Qurtuba University of Science and Information Technology, Peshawar, Pakistan

[2] Professor, Government Superior Science College Peshawar, Pakistan

Corresponding Author: Zahoor Ahmed (zahoorartist@gmail.com)

ABSTRACT This article is an effort of Technical Comparison of Selected Urdu Fonts. The purpose of the article is to identify computer fonts in Nastaliq script that meet traditional calligraphy technical standards. Five fonts have been studied in the context and yardstick of traditional Nastaliq Calligraphy. These are Pak Nastaliq, JameelNooriNastaliq,Faiz Lahori,Alqalam Taj Nastaliq and MehrNastaliq Web. All five fonts are analyzed against selected technical standards of traditional calligraphy of Nastaliq. The study concludes thatMehrNastaliq Web is the best font among them,because it competes and completes the fluency, beauty and traditional calligraphically rules of Nastaliq.Kasheeda characters and compound characters are also added to it, that give natural look and feel of calligraphy.

Keywords: Nastliq, Nastliq Fonts, Urdu Fonts, Calligraphy

اس مضمون میں منتخب اردو فونٹس کے تکنیکی تقابل کی کوشش کی گئی ہے۔ مضمون کا مقصد خطِ نستعلیق میں کمپیوٹر فونٹس کی نشان دہی کرنا ہے جو خطاطی کے روایتی تکنیکی اصولوں پر پورا اترتے ہیں۔ پانچ فونٹس کا نستعلیق کی روایتی خطاطی کے پیمانوں کے حوالے سے مطالعہ کیا گیا ہے۔ ان میں پاک نستعلیق، جمیل نوری نستعلیق، فیض لاہوری، القلم تاج نستعلیق اور مہر نستعلیق ویب شامل ہیں۔ ان تمام فونٹس کا خطِ نستعلیق کی روایتی خطاطی کے منتخب معیارات کے مقابلے میں تجزیہ کیا گیا ہے۔ مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ "مہر نستعلیق ویب" ان میں سب سے بہتر ہے۔ کیوں کہ یہ نستعلیق کی خطاطی کی روانی، خوب صورتی اور روایتی اصولوں پر پورا اترتا اور اس سے لگا کھاتا ہے۔ کشیدہ حروف اور کشیدہ مرکبات بھی اس میں شامل ہیں، جو اسے روایتی اظہار و احساس دیتے ہیں۔

کسی زبان کو لکھنے کے وہ طریقے جس میں رسم الخط کے فنی معیارات کی پابندی کی جائے اُسے خطاطی یا کتابت کہتے ہیں۔ خطاطی یا کتابت کو مشینی صورت میں بھی ڈھالنے کی کوششیں کی گئیں۔ مشینی متن کی تیاری کے لیے اس بات کی بھرپور کوشش کی جاتی کہ خطاطی اور کتابت کے معیار کو برقرار رکھا جائے۔ مشینی کتابت کی ابتدا ٹائپ رائٹر تھا اور پھر کمپیوٹر کے زمانے میں لکھائی کمپیوٹر پر

This work is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)

منتقل ہو گئی۔ خطاطی کا ڈیجیٹل یا کمپیوٹر ہدایات پر مشتمل روپ فونٹ کہلایا۔ اردو فونٹ کے ممتاز ڈویلپر ذی شان نصر کہتے ہیں: "فونٹ متن کی گرافیکل شکل ہے جس میں مختلف قسم کے ٹائپ فیس، پوائنٹ، سائز، وزن (فونٹ کے قط کی موٹائی) اور رنگ شامل ہوتے ہیں۔ "(۱)

اس مقالے میں مختلف اردو فونٹس کا تکنیکی تقابل کیا گیا ہے۔ اس مقالے کی حد تک تکنیکی تقابل سے مراد یہ ہے کہ کمپیوٹر کے لیے تیار کیے جانے والے مختلف نستعلیق فونٹ کس حد تک خطاطی کے طے کردہ روایتی معیارات پر پورے اترتے ہیں۔ اس تجزیے کی غرض سے مقالے کے پہلے حصے میں روایتی معیارات میں سے تین معیارات کا انتخاب اور تعین کیا گیا ہے۔ اس کے بعد انھی معیارات کی بنیاد پر یہ تجزیہ کیا گیا ہے کہ کون سا فونٹ ان روایتی معیارات کے قریب ہے۔ یعنی روایتی معیارات کو مد نظر رکھیں تو اردو نستعلیق لکھنے کے لیے، تکنیکی اعتبار سے، کون سا فونٹ بہتر ہے۔

الف۔ قط اور مفرد حروف:

روایتی خطاطی میں قلم سے لکھائی کی جاتی ہے۔ قلم کا اگلا حصہ جس سے حروف و الفاظ لکھے جاتے ہیں اسے نوے درجے کے زاویے سے قدرے کم درجے پر تیز دھار آلے سے کاٹا جاتا ہے۔ یہی کاٹا ہوا حصہ قط کہلاتا ہے۔

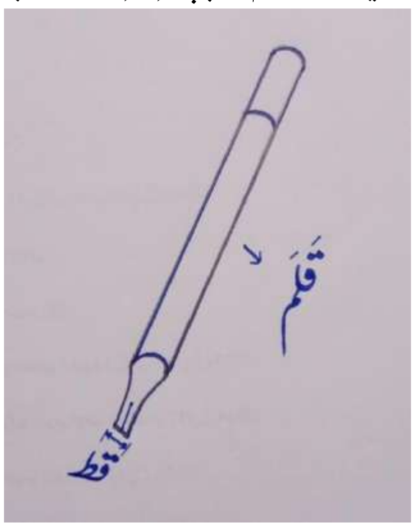

قط کا تصور (راقم السطور)

اس سے کسی حرف کی پیمائش کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ الف کی لمبائی (عمودی طور پر) تین قط ہوتی ہے۔ اس کی موٹائی آدھا قط ہوتی ہے۔ ناخنی "ب" پانچ قط کی ہوتی ہے۔ اس کی ابتدا اور انجام باریک ہوتا ہے۔ دائرے اور دامن 3.25 قط کے ہوتے ہیں۔ دراز "ب" اور کاف گیارہ قط پہ مشتمل ہوتا ہے۔ قاف، "ف" اور "و" کا سرا ڈیڑھ قط کا ہوتا ہے۔ سین کی کش سات، نو یا گیارہ قط کی ہوتی ہے۔ بڑی "ے" کے قط پانچ، سات یا گیارہ ہوتے ہیں۔ "ہ" کی کئی شکلیں ہیں: جیسے آنکڑے کی طرح، گول، کہنی دار، دو چشمی اور گربہ چشم۔ ان اشکال کے قط بھی مختلف ہوتے ہیں۔

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلہ
دریافت

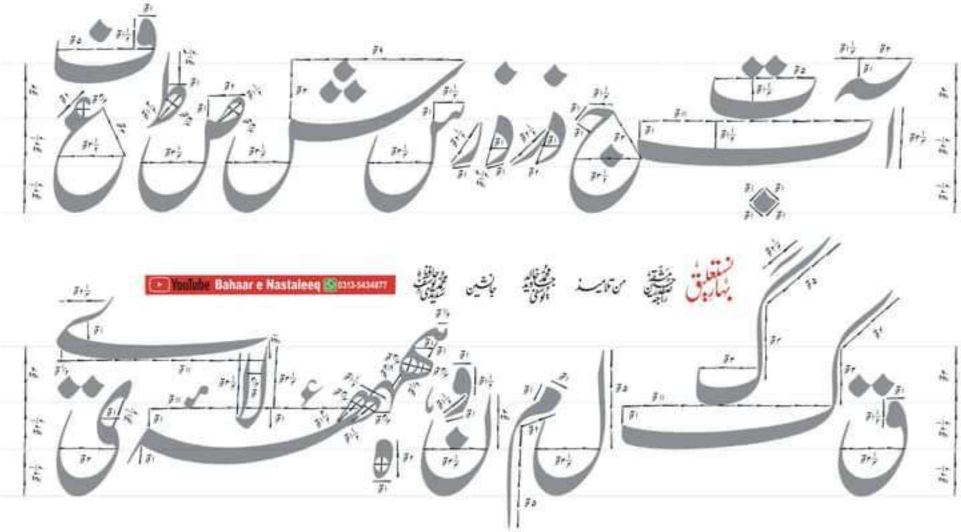

خطاط صفدر راجا کے لکھے ہوئے مفردات، قطوں کی پیمائش کے آئینے میں (صفدر راجا سے لیا گیا عکس)

ب۔ کرسی اور نشست:

خطاطی میں عام طور پہ چار سطریں ہوتی ہیں۔ انھیں عرشی، وصلی، کرسی اور نشست۔ کہا جاتا ہے۔ عام طور پہ مخصوص مفرد حروف کرسی پہ آتے ہیں۔ دائرے اور دامن نشست پہ ختم ہوتے ہیں۔ عرشی اور وصلی کے درمیان تین قط کا فاصلہ ہوتا ہے۔ وصلی اور کرسی کے درمیان اڑھائی قط کا جب کہ کرسی اور نشست کے درمیان بھی اڑھائی قط ہوتا ہے۔ اس کا عکس دیکھا جاسکتا ہے[۲] اس حوالے سے اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ کچھ خطاط ۳، ۲، ۳ کا تناسب بھی رکھتے ہیں۔ اس میں اختلاف کا زاویہ کلک خورشید سے دیکھا جاسکتا ہے۔[۳]
خوش نویسی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جو کتاب کی ضروریات کو پورا کرتی ہے (کتابت) دوسری وہ جو سرخیوں، شہ سرخیوں اور بڑے سائز کے اوراق پہ کی جاتی ہے (خطاطی)۔ عام طور پہ خفی (باریک لکھائی) اور جلی (بڑی لکھائی) کہ کر جان چھڑا لی جاتی ہے۔ لیکن روایتی خطاطی میں لکھائی کی باریکی سے لے کر اس کی موٹائی تک مختلف مدارج ہیں۔ جنھیں غبار، خفی، کتابت، سر فصلی، جلی اور خطاطی (کتیبہ نویسی) کہتے ہیں۔(۴) صفدر راجا کا کہنا ہے کہ کرسی اور نشست کے درمیان ایک قط کا فاصلہ شاعری اور نثر نگاری کے لیے بہترین ہے۔[۴] محمد رفیق رضا محمودی (جواد القلم) نے بھی اپنی کتاب کرسی اور نشست میں ایک قط کا فاصلہ رکھا گیا ہے اور سطریں نو ہیں۔[۵]

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

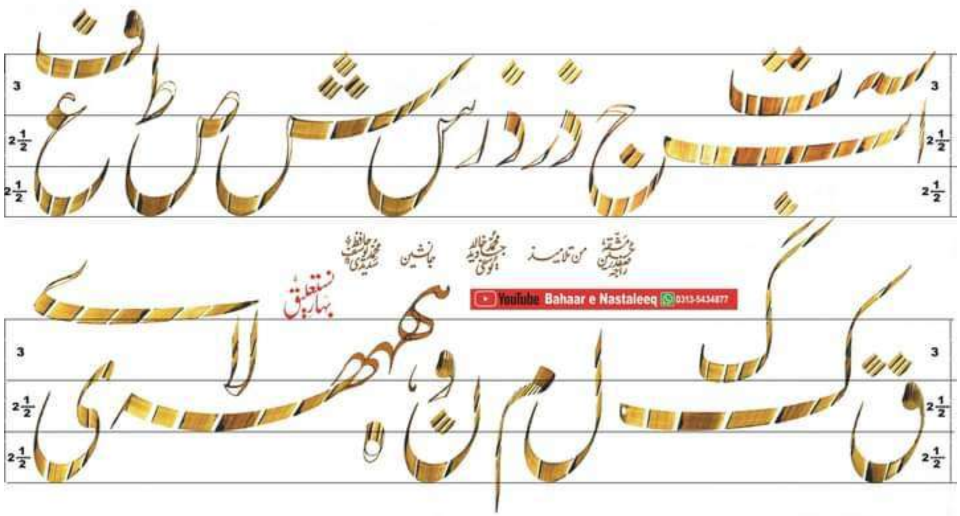

خطاط صفدر راجا کے لکھے ہوئے مفردات، سطور کے درمیان فاصلے کے آئینے میں (صفدر راجا سے لیا گیا عکس)

ج۔ مرکب حروف (جوڑ اور پیوند):

پہلی تختی مکمل کرنے کے بعد دو حرفی مرکبات کی مشق کرائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر پہلی تختی کے تمام حروف کو "ب" کے ساتھ ملایا جاتا ہے۔ پھر "ج" کے ساتھ اور علیٰ ہٰذا القیاس۔ مرکبات بناتے وقت جوڑ اور پیوند بنائے جاتے ہیں۔ کسی بھی حرف کی ابتدائی اشکال آپس میں ہر حرف کے ساتھ ملتی ہیں تو ان میں تبدیلی آتی ہے۔ مثال کے طور پہ ب تمام حروف کے ایک جیسی شکل اختیار نہیں کرے گی۔ اس طرح جیم، سین اور علیٰ ہٰذا القیاس!

اس آرٹیکل میں اردو کے پانچ مختلف فونٹس پاک نستعلیق، جمیل نوری نستعلیق، فیض نستعلیق، القلم تاج نستعلیق اور مہر نستعلیق کا تجزیہ کیا گیا ہے جن کا مختصر تعارف یہ ہے:

I۔ پاک نستعلیق پہلا اردو کا فونٹ ہے۔ یہ ۲۰۰۸ میں محسن حجازی نے بنایا۔ (۶) یہ اردو کو کمپیوٹر انقلاب سے ہم آہنگ کرنے کی پہلی جست تھی۔

II۔ جمیل نوری نستعلیق عارف کریم، نعیم سعید اور عبد المجید (۷) نے بنایا۔ یہ فونٹ ۲۰۰۸ء میں منظر عام پہ آیا۔ اس کا دوسرا ورژن ۲۰۱۶ میں آیا۔

III۔ فیض نستعلیق فونٹ کے موجد ڈاکٹر ریحان انصاری ہیں۔ ان کے معاون اسلم کرتپوری تھے۔ یہ فونٹ ۲۰۰۹ بنایا گیا۔ (۸)

IV۔ القلم تاج نستعلیق کے بانی شاکر القادری ہیں۔ ۲۰۱۶ میں ان کا فونٹ مارکیٹ میں آیا۔ (۹)

V۔ مہر نستعلیق ویب کے خالق ذی شان نصر ہیں۔ یہ فونٹ ۲۰۱۷ میں منظرِ عام پہ آیا۔ (10)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

الف۔ قط اور مفرد حروف کے لحاظ سے فونٹس کا تجزیہ:

اس حصے میں مذکورہ فونٹس کی پیمائش روایتی خطاطی کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ یہ تجربات راقم السطور نے کیے جن کے عکس اس آرٹیکل میں شامل کیے گئے ہیں۔ یہ تجزیہ درج ذیل ہے:

پاک نستعلیق فونٹ: اس فونٹ کو دہلوی اسلوب کی تقلید میں بنایا گیا۔ الف کے چار قط دہلوی اسلوب میں ہوتے ہیں۔ اس میں پانچ قط رکھے گئے ہیں۔ "ب" کے چار قط ہوتے ہیں؛ فونٹ میں پانچ قط رکھے گئے ہیں۔ روایتی نستعلیق میں جیم کا دامن چار قط سے زائد ہے۔ لیکن فونٹ میں اسے تنگ رکھا گیا ہے۔ دراز سین اس میں نہیں ہے۔ صاد کے سرے اور دائرے دونوں میں ایک ہی پیمائش کے ہیں۔ کاف کا کش روایتی خطاطی میں ساڑھے تین قط ہے جب کہ افقی لمبائی پانچ قط ہے۔ فونٹ میں کش تین قط کا ہے اور لمبائی چار قط ہے۔ یعنی کاف روایتی خطاطی کے مقابلے میں چھوٹا ہے۔ لام کا الف پانچ قط ہوتا ہے۔ اور دائرہ تین قط۔ فونٹ میں اس کا الف سوا چار قط رکھا گیا ہے۔ فونٹ میں میم کا لہر دار حصہ خطاطی کے لحاظ سے قدرے کم ہے۔ یعنی پانچ قط کی بجائے سوا چار قط رکھا گیا ہے۔۔ فونٹ میں "ے" کی پیمائش روایتی چھے قط ہے جب کہ روایتی خطاطی میں چھے ہوتی ہے۔

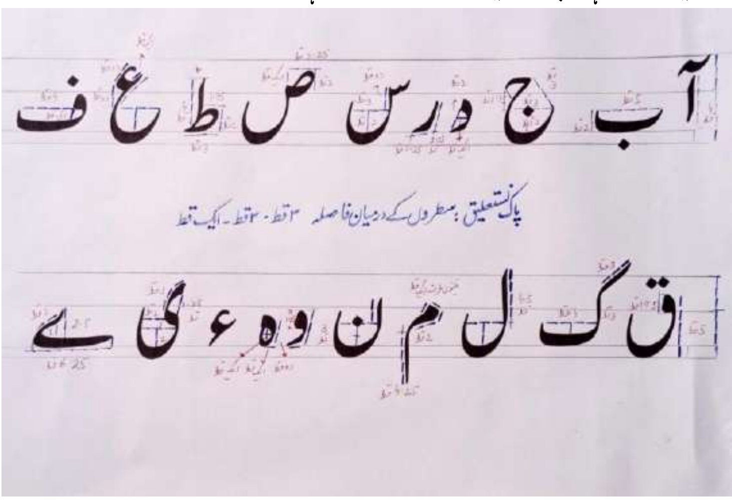

یہ پاک نستعلیق کا ایک نمونہ ہے۔ جس میں اس کے مفرد حروف کی پیمائشیں بھی دی گئی ہیں۔ (راقم السطور)

جمیل نوری نستعلیق: یہ فونٹ بھی بالکل انھی اصولوں پہ بنایا گیا ہے جن پہ پاک نستعلیق بنایا گیا ہے۔ جمیل نوری نستعلیق اور پاک نستعلیق میں فرق فقط یہ ہے کہ پاک نستعلیق میں جمیل کے مقابلے میں نقطے کم سائز کے رکھے گئے ہیں۔ ذیل میں دونوں فونٹس اور روایتی خطاطی کے عکس دیے گئے ہیں۔ انھیں دیکھ کر روایتی خطاطی اور فونٹ کا موازنہ کیا جاسکتا ہے:

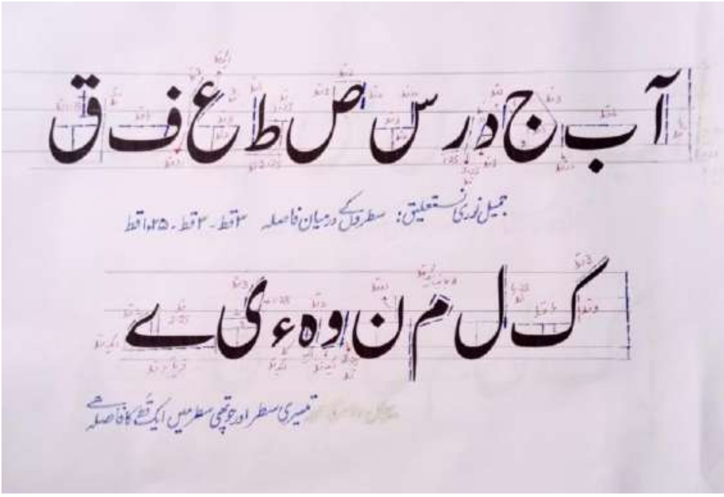

یہ جمیل نوری نستعلیق کا نمونہ ہے۔اس میں مفرد حروف کی پیمائشیں دی گئی ہیں۔(راقم السطور)

ذیل میں ایک کتاب رہنمائے اردو خوش نویسی سے لیا گیا ایک عکس یہاں دیا جارہا ہے۔[11]

دہلوی نستعلیق کے مفردات کا نمونہ (رہنمائے خوشنویسی)

فیض نستعلیق فونٹ: فیض نستعلیق میں "ب" کے پانچ کی بجائے چار قط ہیں۔"ب" کشیدہ کا تصور نہیں ہے۔ جیم اور عین کے دامن ساڑھے تین کی بجائے تین قط کے ہیں۔ دائرے والے حروف کے دائرے بھی ساڑھے تین کی بجائے تین قط کے ہیں۔ سین کے داندانے لہریے دار کی بجائے شد نما ہیں جو لاہوری نستعلیق کے حساب سے غلط ہیں۔ دراز سین کا تصور نہیں ہے۔"ف"،"و"،"ق" کے سرے کو پونے دو قط لمبائی دی گی ہے جو خطاطی کے اصولوں کے مطابق نہیں ہے۔ لیکن چوں کہ یہ کتابت کے لیے تیار کیے گئے فونٹ ہیں

اس لیے ان کی لمبائی قدرے زیادہ رکھی گئی ہے۔ خطاطی میں کاف کا کش پانچ قط ہوتا ہے اور اور اس کی عمودی اور اور افقی لمبائی بالترتیب پانچ اور تین ہوتی ہے۔ فونٹ میں سرکس کی لمبائی تین قط رکھی گئی ہے۔ عمودی اور افقی لمبائیاں اڑھائی اور چار رکھی گئی ہیں۔ لام کا الف پانچ کی بجائے چار قط رکھا گیا ہے۔ چھوٹی "ی" کے سرے اور گولائی کے درمیان ایک قط رکھا گیا ہے بڑی "ے" کے قط پانچ رکھے گئے ہیں۔

القلم تاج نستعلیق: اس کی پیمائشیں وہی ہیں جو فیض نستعلیق کی ہیں۔ کچھ حروف میں فرق ہے جیسے کاف کا کش ساڑھے تین قط کا ہے۔ عمودی اور افقی لمبائی بالترتیب تین اور تین قط ہے۔ جب کہ کاف میں ایک آرایشی علامت بھی شامل کر دی گئی ہے۔

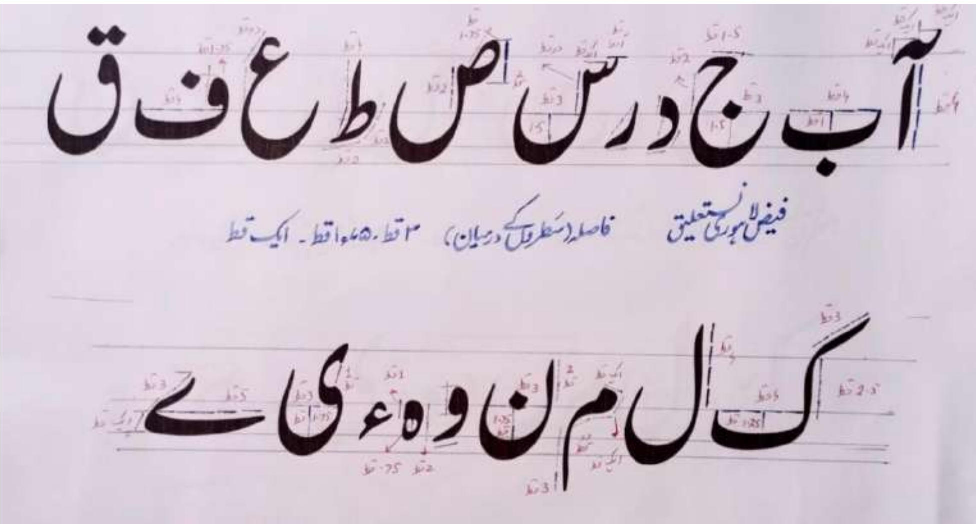

فیض لاہوری نستعلیق کے مفردات (راقم السطور)

اگر دیکھا جائے تو فونٹ اور فیض کی خطاطی کا کوئی موازنہ نہیں بنتا۔ اس فونٹ کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن جمالیاتی لحاظ سے فیض کے کام کی گرد تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔ فیض مجدد کی خطاطی کے نمونے سے یہ بات واضح ہے۔ (۱۲)

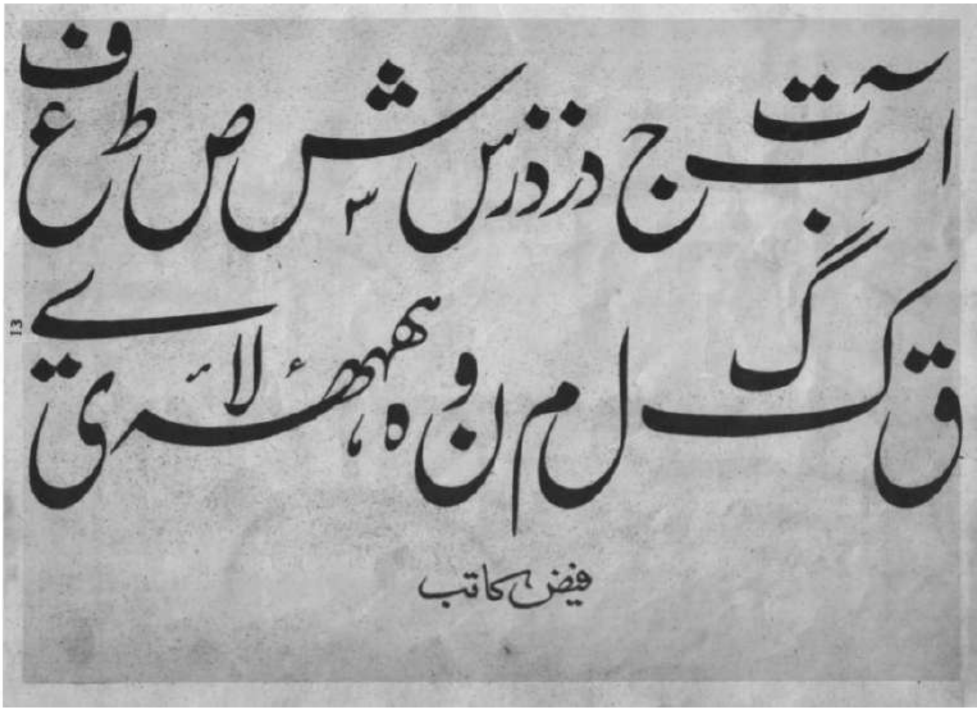

فیض مجدد کے لکھے ہوئے مفردات (مرقع فیض)

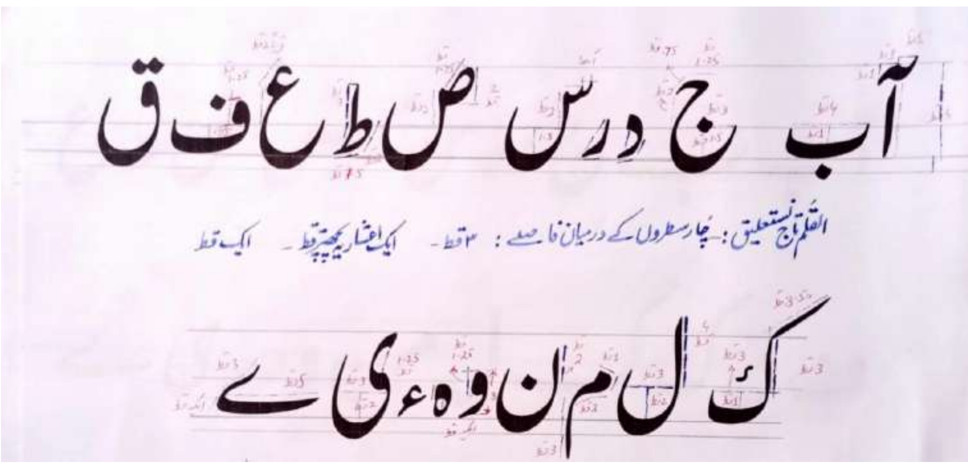

القلم تاج نستعلیق کے مفرد حروف کا نمونہ (راقم السطور)

اس فونٹ کو تاج الدین زریں رقم کے کام سے منسوب کیا گیا۔ (۱۳)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلہ
دریافت

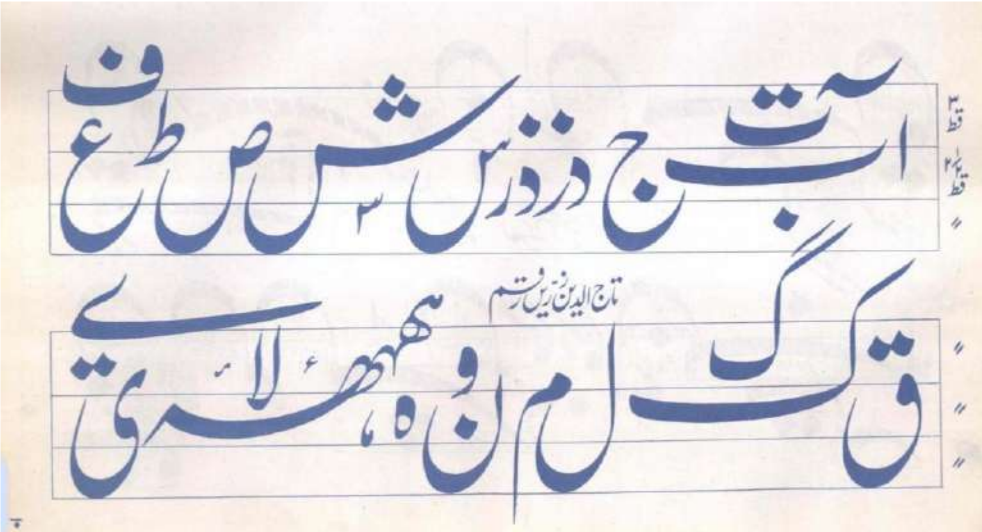

تاج الدین زریں رقم کے لکھے ہوئے مفردات (مرقع زرین)

مہر نستعلیق فونٹ: یہ فونٹ لاہوری نستعلیق کے مطابق بنایا گیا ہے۔اس کے ڈویلپر ذی شان نصر ہیں۔ان کے والد نصر اللہ مہر خطاط ہیں۔ان کی خطاطی کو ٹریس کر کے یہ فونٹ تخلیق کیا گیا ہے۔جو خود نستعلیق لاہوری اسلوب میں لکھتے ہیں۔اس فونٹ میں الف کی لمبائی ساڑھے تین قط رکھی گئی ہے۔خطاطی میں اس کی لمبائی تین یا چار قط ہوتی ہے۔"ب" دراز کی لمبائی نو قط رکھی گئی ہے۔ویسے بھی خطاطی میں اس کی لمبائی طاق عدد میں ہوتی ہے اور خطاطی میں گیارہ قط مقبول ہے۔اس کی گہرائی سوا قط رکھی گئی ہے۔جو خطاطی کے اصولوں پہ پورا اترتی ہے۔کتابت کے نکتۂ نظر سے سین کے دندانے کچھ بڑے رکھے گئے ہیں۔دائرہ عموماً چھوٹا رکھا جاتا ہے۔اس لیے فونٹ کے دائرے اور دامن تین قط کے رکھے گئے ہیں۔(خطاطی میں سین کے دندانے بالترتیب آدھا اور پورا قط رکھے جاتے ہیں۔) سین کا پہلا دندانہ پونے قط اور دوسرا سوا قط رکھا گیا ہے۔دراز سین کی لمبائی آٹھ قط رکھی گئی ہے۔اور اس کی گہرائی تین قط ہے۔خطاطی میں سین کی لمبائی عام طور پر طاق ہوتی ہے۔گیارہ قط مقبول ہے۔اس طرح لمبائی کے لحاظ سے اس اصول سے اغماض کیا گیا ہے۔دائرے تمام تین قط کے ہیں اور جیم کا دامن سوا تین ہے۔یہ خطاطی کے لحاظ سے کم ہے لیکن کتابت میں اسے مناسب سمجھا جاتا ہے۔کاف عمودی طور پر چار قط اور افقی طور پہ تین قط ہوتا ہے۔کش کی لمبائی اس فونٹ میں تین قط رکھی گئی ہے۔افقی (کشتی کی) لمبائی تین قط رکھی گئی ہے۔خطاطی میں دراز کاف کا کش چار قط رکھا جاتا ہے۔عمودی لمبائی چار قط اور افقی لمبائی گیارہ قط ہوتی ہے۔مہر نستعلیق میں کش کی لمبائی تین قط، عمودی لمبائی تین قط اور افقی لمبائی نو قط رکھی گئی ہے۔خطاطی میں لام کا الف پانچ قط کا ہوتا ہے لیکن فونٹ میں چار قط رکھی گئی ہے۔میم کا نقطہ نما حصہ خطاطی کے مطابق تینوں جانب سے ایک ایک قط ہے۔اس کی لمبائی (لہر دار حصہ) پانچ قط کی بجائے سو چار قط ہے۔نون کا الف دو قط ہے یعنی خطاطی کے مطابق۔"و" اور "ہ" خطاطی کے مطابق ہیں۔چھوٹی "ی" کی ابتدا اور بعد ازاں آنے والے بازو کے درمیان فاصلہ ڈیڑھ قط کی بجائے سوا ایک قط ہے۔بڑی ے کے چھے قط ہیں۔

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلّہ
دریافت

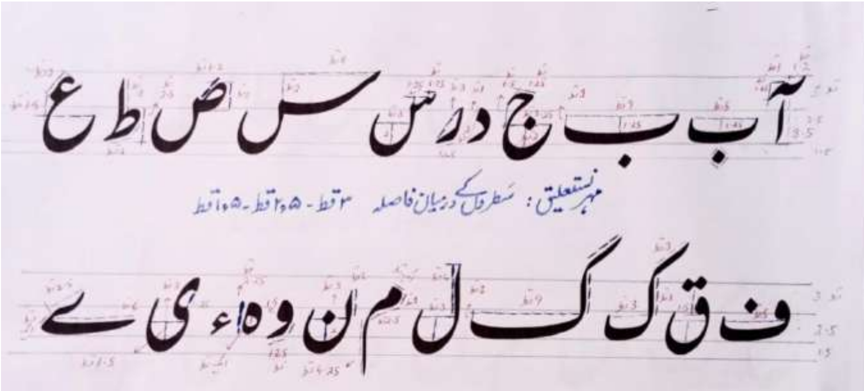

مہر نستعلیق کے مفردات کا نمونہ (راقم السطور)

اس فونٹ کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں دراز یا کشیدہ حروف شامل کیے گئے ہیں۔

خطاطی کی بناوٹ اور روانی کو مدِ نظر رکھا جائے تو دہلوی اسلوب میں جمیل نوری نستعلیق کی اشکال دہلوی اسلوب کے مطابق ہیں۔ ان میں حروف کی باریکیوں کو نہیں دیکھا گیا۔ ان باریکیوں کو دبیز رکھا گیا ہے۔ اس میں جمالیاتی پہلو کو کم اور افادی پہلو کو زیادہ اہم سمجھا گیا ہے۔ چوں کہ یہ فونٹ کتابت کے لیے بنایا گیا ہے اس لیے ان جگھوں کو دبیز رکھا گیا ہے۔ تا کہ ان کے پوائنٹس کم بھی ہوں تو واضح نظر آئیں۔ اس فونٹ میں دراز اور کشیدہ حروف شامل نہیں کیے گئے۔ اس لیے یہ فونٹ فطری خطاطی کے قریب نہیں ہے۔ یہی صورت حال پاک نستعلیق کی بھی ہے۔ اس کے نقطے چھوٹے ہیں۔ جو دیکھنے میں نظر کو کھٹکتے ہیں۔ اس میں دراز اور کشیدہ حروف شامل نہیں ہیں۔ فیض لاہوری اور القلم تاج اگرچہ اسلوبِ لاہوری کے تحت بنائے گئے ہیں، لیکن ان میں وہ لوچ اور روانی نہیں ہے جو لاہوری حروف میں ہوتی ہے۔ اس لیے یہ حروف مصنوعی نظر آتے ہیں۔ ان حروف میں کسی ثقہ خطاط کا رنگ نظر نہیں آتا۔ اس لیے جب ان میں کمپوزنگ کی جاتی ہے تو دل کشی نہیں ہوتی۔

مہر نستعلیق پہلا نستعلیق فونٹ ہے جو کسی خطاط کی خطاطی کو ٹریس کر کے بنایا گیا ہے۔ اس لیے اس میں خطاطی کی نزاکت اور لوچ کا خیال رکھا گیا ہے۔ حروف کے باریک حصوں کو کتابت کی ضرورت کے تحت موٹا کیا گیا ہے۔ اور اتنا دبیز رکھا گیا ہے کہ فونٹ کی خوب صورتی متاثر نہیں ہوتی اور تکنیکی ضرورت بھی پوری ہوتی ہے۔ کشیدہ حروف کسی بھی خط کی خوب صورتی کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ اس فونٹ میں ب، سین اور کاف کی کشیدہ صورتیں نظر آتی ہیں۔ اس لیے دیکھا جائے تو یہ سب سے منفرد اور بہتر فونٹ ہے۔ یہ فونٹ کتابت کے اتنا قریب ہے کہ جو شخص فونٹ کے بارے میں نہ جانتا ہو اسے لگے گا کہ یہ ہاتھ سے کیا کام ہے۔

ب۔ کرسی و نشست اور فونٹ:

پاک نستعلیق فونٹ میں سطروں کے درمیان کل فاصلہ سات قط بنتا ہے۔ اس کا تناسب تین، تین اور ایک ہے۔ یعنی کرسی اور نشست کے درمیان ایک قط کا فاصلہ ہے۔ جو کتابت اور خطاطی کے اصولوں کے لحاظ سے بہترین ہے۔ **جمیل نوری نستعلیق** میں سطروں کا فاصلہ تین، تین اور سوا ایک ہے۔ یعنی کل فاصلہ سوا سات قط / سات ہے۔ کرسی اور نشست میں جو الف سے قاف تک رہتا

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

ہے۔باقی حروف میں کرسی اور نشست کے درمیان فاصلہ ایک قط ہے۔**فیض لاہوری نستعلیق** میں سطروں کے درمیان فاصلہ تین، پونے دو اور ایک قط ہے۔یعنی کرسی اور نشست میں ایک قط کا فاصلہ ہے۔**القلم تاج نستعلیق** میں تین، پونے دو اور ایک قط ہے۔اس فونٹ میں بھی کرسی اور نشست کا فاصلہ ایک قط جا بنتا ہے۔**مہر نستعلیق** فونٹ کا کل فاصلہ سات قط ہے۔یعنی تین، اڑھائی اور ڈیڑھ۔اس طرح اس میں کرسی و نشست کا فاصلہ ڈیڑھ قط ہے۔

تجربات سے ثابت ہوا کہ کرسی اور نشست میں مہر نستعلیق فونٹ کے علاوہ ایک قط کو ترجیح دی گئی ہے۔بہر حال اسے بھی معیاری سمجھا جاتا ہے۔

ج۔مرکب حروف اور فونٹ:

پاک نستعلیق فونٹ: اس فونٹ میں حروف میں روانی نہیں ہے، جیسی کہ قلم میں پائی جاتی ہے۔مثال کے طور پہ لفظ کلیسا کو دیکھا جائے۔ کہیں کہیں حروف ٹوٹ جاتے ہیں جیسے عصمت۔ کہیں حروف کی ابتدا بہت باریک ہے۔ جیسے تسبیح، بھیج وغیرہ۔ کہیں حروف کی بناوٹ ٹوٹ جاتی ہے۔ جیسے لفظ تحقیق میں "ح" جب "ق" سے ملتی ہے تو قاف سے ملنے والے حصے میں جھول آجاتا ہے۔لیکن چوں کہ یہ کتابت کے لیے بنایا گیا ہے اس لیے اس نقص کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔اور ویسے بھی کم سائز میں یہ واضح نہیں ہوتا۔تین گاف اگر کسی لفظ میں آجائیں تو ان کے زاویے ایک جیسے نہیں رہتے۔

مرکب حروف نمونے (ایم ایس ورڈ پر کمپوزنگ کا عکس)

جمیل نوری نستعلیق: اس میں حروف کی بناوٹ میں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔مرکب حروف میں بھی زیادہ مسائل نہیں ہیں۔جوڑ اور پیوند بھی دہلوی اسلوب کے مطابق ہیں۔اس میں حروف کے باریک حصوں کو مناسب موٹائی دی گئی ہے۔اس انداز سے کہ مرکب ہونے کی صورت میں بھی بھدے معلوم نہیں ہوتے ہیں۔اس فونٹ کو بہتر پوائنٹ پہ لے جا کے دیکھا گیا تب بھی مسائل نہیں تھے۔البتہ دراز سین (جب دو سین اکٹھے ہوتے ہیں) کو خطاطی کے اصولوں کے مطابق رکھا جاتا ہے۔مثال کے طور پر سسی۔تو دراز سین کے قط اور نارمل حرف (سسی میں چھوٹی ی) کے قط میں فرق ہوتا ہے۔ گاف اگر تین بار کسی لفظ میں آجائے تو اس میں زاویے یکساں نہیں رہتے۔

مرکب حروف نمونے(ایم ایس ورڈ پر کمپوزنگ کا عکس)

فیض نستعلیق: اس میں خطاطی کی روانی نہیں ہے۔ قلم کا قط تو کتابت یا خطاطی میں یکساں رہتا ہے۔ لیکن اس فونٹ میں ایسا نہیں ہے۔ مثال کے طور پہ کلیسا میں کاف کے گول حصے کا قط اور لام کا وہ حصہ۔

۔ کلیسا۔ بیجر

مرکبات(ایم ایس ورڈ کمپوزنگ کا عکس)

جہاں قلم کا قط پورا ہوتا ہے؛ برابر نہیں ہیں۔ کہیں نہ کہیں خطاطی کے اصولوں کو بری طرح نظر انداز کیا گیا ہے۔ جیسے ایک مرکب بیجر ہے

القلم تاج نستعلیق: اس میں خطاطی کے اصولوں کی نفی کی گئی ہے۔ کہیں حروف کا قط کم اور کہیں زیادہ کر دیا گیا ہے۔ یا پھر حروف کی ابتدا بہت باریک کر دی گئی ہے، جیسے لفظ کلیسا میں کاف کا کش انتہائی باریک رکھا گیا ہے۔ اسے بہتر پوائنٹ پہ لے جانے کے بعد بھی دیکھا گیا تو بھی باریک نظر آیا۔ اس طرح "ح" کے دامن کا باریک حصہ انتہائی باریک کر دیا گیا ہے۔ دامن کا وہ حصہ جو پورے قط کا ہوتا ہے؛ باقی حروف کی خالی کشتیوں کے پورے قط والے حصوں کے مقابلے میں کم ہے۔ ایک مرکب صورت "نھر" میں قط کی موٹائی انتہائی کم رکھی گئی ہے۔ مرکب صورت "بیجر" خطاطی کے کسی اصول پہ پورا نہیں اترتی۔ لفظ تعظیم میں ظ کے الف کا آخری حصہ بہت

۔ کلیسا۔ خلیج۔ پیٹنٹ۔ نھر۔ بیجر۔ تعظیم

باریک رکھا گیا ہے۔ جب اس کا سائز کم کر دیا جائے تو نظر نہیں آتا۔

چند مرکب حروف(ایم ایس ورڈ پر کمپوزنگ کے بعد لیا گیا عکس)

مہر نستعلیق فونٹ: اس میں حروف کی بناوٹ اور روانی پائی جاتی ہے۔ حروف کے جوڑ اور پیوند کتاب اور خطاطی کے اصولوں کے مطابق بنائے گئے ہیں۔ دائرے اور دامن دیدہ زیب ہیں۔ دراز حروف بھی ہیں۔ مرکب صورت میں بھی دراز حروف مل جاتے ہیں۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ جوڑ اور پیوند میں کہیں جھول ہو۔ البتہ کہیں نہ کہیں یہ مسئلہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پہ لفظ تعظیم میں "ی" اور "م" کے پیوند میں جھول نظر آتا ہے۔ لفظ بھیج میں "بھ" اور "ی" کے پیوند میں جھول ہے۔

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

تحقیقی و تنقیدی مجلہ
دریافت

مرکبات (ایم ایس ورڈ پر کی گئی کمپوزنگ کا ایک عکس)

لیکن یہ فونٹ کتابت کے لیے بنایا گیا ہے اس لیے اس کو اہم نہیں سمجھا جاتا اور کم سائز میں اس نقص کو محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کام چل جاتا ہے۔ یہاں اس کی مرکب اور مفرد صورت میں دراز اشکال دیکھی جاسکتی ہیں۔ جو اس کی انفرادیت کا منھ بولتا

ثبوت ہیں۔

مرکبات (ایم ایس ورڈ پر کی گئی کمپوزنگ کا ایک عکس)

مشمولہ پانچ فونٹس کے مندرجہ بالا تکنیکی تجزیے سے واضح ہے کہ تمام معیارات پر مہر نستعلیق سب سے بہتر ہے۔

پاک نستعلیق فونٹ میں حروف کا ٹوٹنا، روانی کی عدم موجودگی یا حروف کے ابتدائی حصوں کی باریکی کا زیادہ ہونا شامل ہیں۔ فیض نستعلیق میں بھی روانی نہیں ہے۔ الفاظ و حروف میں قط کی یکسانی بھی نہیں ہے۔ کہیں نہ کہیں خطاطی کے اصولوں کو بری طرح نظر انداز کیا گیا ہے۔ القلم تاج نستعلیق میں حروف کو بہت باریک کر دیا گیا ہے۔ کہیں قط کی یکسانی کی عدم موجودگی نظر آتی ہے۔ کہیں خطاطی کے اصولوں کو بالائے طاق رکھا گیا ہے۔ البتہ جمیل نوری نستعلیق میں مسائل کم ہیں۔ حروف کے باریک حصوں کو اس حد تک دبیز کیا گیا ہے کہ ان کا جمالیاتی پہلو متاثر نہیں ہوتا۔ اور افادی اہمیت بھی برقرار رہتی ہے۔ مہر نستعلیق میں یہ مسائل نہیں ہیں۔ ان میں روانی بھی پائی جاتی ہے۔ اور جمالیاتی نکتہ نظر کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ حروف کے باریک حصوں کو اتنا باریک نہیں کیا گیا کہ پوائنٹ کم ہونے پہ نظر نہ آئیں۔ انھیں اتنا دبیز نہیں کیا گیا کہ بھدے لگیں۔ دراز حروف کی کمی ہمیشہ اردو فونٹس میں محسوس ہوتی رہی ہے جو اردو کی روایتی خطاطی کا خاصہ ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اردو کے باقی چار فونٹس کے مقابلے میں منفرد اور سب سے خوب صورت ہے اور خطاطی کی روایت کا امین بھی۔ اس لیے یہ روایتی خطاطی کے قریب ہے۔ اس کی بنیادی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اردو کی خطاطی (نصر اللہ مہر) کو ٹریس کر کے بنایا گیا ہے۔ یہ پہلا فونٹ ہے جو ایک خطاط کے کام کو من و عن ٹریس کر کے بنایا گیا ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ مصاحبہ، ذی شان نصر، بمقام سرگودھا، بوقت ۱۰ بجے دن، ۱۴ اپریل، ۲۰۲۲ء

۲۔ زریں رقم، تاج الدین، مرقع زریں، لاہور، صابری دارالکتب، ص۹

۳۔ گوہر خورشید عالم، کلک خورشید، لاہور، کیلی گرافرز ایسوسی ایشن، ۲۰۱۹ء، ص ۲۰

۴۔ امیر خانی، آداب الخط، ایران، انجمن خوش نویسیاں ایران وزارت فرہنگ وارشاد اسلامی، سن ندارد، ص ۶

۵۔ https://youtu.be/bzY5Rp_OalY تاریخ استفادہ ۸ اپریل ۲۰۲۴ء

۶۔ رفیق رضا، محمد، محمودی؛ تدریس کتابت، ملتان، کتب خانۂ مجیدیہ، ص۵

۷۔ https://ur.wikipedia.org/wiki/ پاک نستعلیق / تاریخ استفادہ ۵ فروری ۲۰۲۴ء

۸۔ مصاحبہ، عارف کریم، بذریعہ فیس بک میسنجر گروپ "اردو فونٹ سازی" بوقت ۱۰ بجے رات، اگست ۲۰۲۳ء

۹۔ https://www.taemeernews.com/2013/10/Faiz-Lahori-urdu-nastaleeq-font.html/ تاریخ استفادہ ۲ جنوری ۲۰۲۴

۱۰۔ https://www.urduweb.org/mehfil/threads/ القلم تاج نستعلیق فونٹ ریلیز، تاریخ استفادہ ۲ دسمبر ۲۰۲۳ء

۱۱۔ خلیق ٹونکی، رہنمائے اردو خوشنویسی، دہلی، ٹونکی آرٹ پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء، ص ۳۵

۱۲۔ فیض مجددی، مرقع فیض، بمبئی، ۱۸۰ کا گل والا بلڈنگ، پیر خان سٹریٹ، ۱۹۸۲ء، ص ۱۳

۱۳۔ زریں رقم، تاج الدین، مرقع زریں، لاہور، صابری دارالکتب، ص ۱۱

References in Roman Script:

1. Interview,Zeeshan Nasr, Sargodha, at 10 am,April,14,2022
2. Zareen Raqqm,Muraqqa e Zareen,Lahore,Sabri Library,P.9
3. Gohar,Khusheed Alam,Qalam Of Khursheed,Lahore,Calligraphers Association,2019,P.20
4. Ameer Khani,Adaab ul Khatt, Iran ,Islamic Ministry of Farhang o Irshad,P.6
5. https://youtu.be/bzY5Rp_OalY,date:April ,8,2024
6. .Rafique Raza , Muhammad, Teaching Of Calligraphy .Multan, Majeed Book Depot, P.5
7. https://ur.wikipedia.org/wiki/pak nastaliq/date:February 5,2024
8. Interview, Arif Kareem, Face Book Messenger, Urdu Font Making, at 10 pm, August 2023
9. https://www.taemeernews.com/2013/10/Faiz-Lahori-urdu-nastaleeq-font.html,date:January 2024/
10. https://www.urduweb.org/mehfil/threads/Aqalam Nastaliq Font Release, date: December 2,2024
11. Khaleeq Tonki, Dehli ,Urdu Calligraphy Guide ,Tonki Art Publications.1994,P.35

12. Faiz Mujaddidi, Muraqqa e Faiz,Bombay,18 Kagal's Building, Peer Khan Street ,P.13
13. Zareen Raqqm,Muraqqa e Zareen,Lahore,Sabri Library, P.11

Mr. Zahoor Ahmad is a Ph.D. scholar at Qurtuba University of Science & Information Technology, Peshawar, Pakistan. He holds an M.Phil. in Urdu Linguistics. His academic focus lies in exploring the structural and functional aspects of the Urdu language, with his research contributing to advancements in this domain.

Professor Raees Ahmad Mughal, a distinguished academician in Urdu Linguistics, serves as a Professor at Govt Superior Science College, Peshawar. He earned his Ph.D. from the University of Peshawar, Pakistan. He has made remarkable contributions to his field through 12 published books and 05 research articles in esteemed journals. He also received three prestigious awards

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلہ
دریافت

Received: 26th Aug, 2024 | Accepted: 1Oth Dec, 2024 | Available Online: 31st Dec, 2024
Digital Object Identifier: 10.52015/daryaft.v16i02.396

لارنس وینوتی کے نظریات ترجمہ کے تحت منٹو کے افسانہ "ممی" کے انگریزی تراجم کا مطالعہ

A Study of English Translations of Manto's Short Story "Mummy" under Lawrence Venuti's Theories of Translation

ITRAT BATOOL[1] And DR. AQLIMA NAZ[2]
[1] Scholar Ph.D. Urdu, Department of Urdu Zuban-O-Adab, Fatima Jinnah Women University, Rawalpindi, Pakistan
[2] Assistant Professor, Department of Urdu Zuban-O-Adab, Fatima Jinnah Women University, Rawalpindi, Pakistan
Corresponding Author: Dr. Aqlima Naz (aqlimanaz@fjwu.edu.pk)

ABSTRACT Manto is a distinguished name of Urdu fiction. Due to individuality of the themes, his short stories are popular not only among Urdu readers but they have also gained popularity at the international level too. The one reason of this international popularity is that his short stories are translated into English. This is the fact that an English translation of a piece of literature increases its international readership, but it is also important to keep in m in d that the translated text is never the same as the original. During the translation, some of the beauty of stylistics remains in the text. It often happens that the culture of the source text is different from the culture of the target text and hence the languages used in the two texts are also different. These differences often prevent some particulars of the source text from imparting into the translation. Translation experts have introduced various strategies to reduce this discrepancy between text and translation and to maintain a balance between text and translation. One of the well-known strategies proposed by the American translation expert Lawrence Venuti is known as "domestication and foreignization". This paper examines two English translations of Manto's short stories "Mummy" in the light of the strategies proposed by Lawrence Venuti. The reason for the selection of the topic is that there is no existing research whether Manto's fiction is translated accordingly or not. Comparative Research method is used to analyze the gap between source text and translated text. The findings of the study will be analyzed through the lens of Venuti's translation theories in the conclusion.

Keywords: Manto, Source Text, Target Text, Lawrence Venuti, Domestication, Foreignization

منٹو اردو افسانہ نگاری کا معتبر نام ہیں۔ ان کے افسانوں کے موضوعات اپنے انفراد کے باعث نہ صرف اردو کے قارئین میں مقبول ہوئے بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی انہیں یکساں مقبولیت ملی ہے۔ اس کی ایک وجہ ان کے افسانوں کے انگریزی تراجم ہیں۔ یہ درست ہے کہ کسی ادب پارے کا انگریزی ترجمہ اس کے بین الاقوامی قارئین کی تعداد میں اضافہ کرتا ہے تاہم یہ بھی مد نظر رکھنا ضر و ری ہے کہ مترجمہ متن کبھی بھی اصل کی مثل نہیں ہوتا۔ ترجمہ کے دوران کچھ نہ کچھ حسنِ بیان متن میں ہی رہ جاتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ماخذ متن کی ثقافت ہدف متن کی ثقافت سے مختلف ہوتی ہے اور اس اعتبار سے دونوں متون میں استعمال کی جانے والے زبان بھی

This work is licensed under a [Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)]

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

مختلف ہوتی ہے۔ یہ اختلاف اکثر ماخذ متن کی جزئیات کو ترجمہ میں در آنے سے روکتی ہے۔ متن اور ترجمہ میں میں اس اختلاف کو کم کرنے اور متن وترجمہ میں توازن قائم رکھنے کے لیے ماہرین ترجمہ نے مختلف حکمت عملیاں متعارف کروائی ہیں۔ ان میں سے ایک معروف حکمت عملی امریکی ماہر ترجمہ لارنس وینوتی نے پیش کی ہے جسے ڈومیسٹی کیشن اور فارنائزیشن کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مقالہ ہذا میں منٹو کے افسانہ "ممی" کے دو انگریزی تراجم کا مطالعہ لارنس وینوتی کی پیش کردہ حکمت عملیوں کے تحت کیا گیا ہے۔

اردو افسانہ نگاری میں منٹو کا نام ومقام کسی تعارف کا محتاج نہیں، اچھوتے موضوعات پر بیباک تحریریں منٹو کا خاصا ہیں۔ منٹو کو اس طرزِ تحریر پر خاصی مخالفت کا سامنا رہا لیکن منٹو نے اپنی ڈگر نہ چھوڑی اور اپنے قلم سے ایسے موضوعات تسطیر کیے کہ جن پر عام طور پر بات کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا۔ منٹو پر اگرچہ عریاں نگاری کا ٹھپہ بہت پختگی سے گاڑا گیا ہے تاہم ان کے افسانوں میں کثیر تعداد معاشرے کے مثبت موضوعات سے متعلق بھی ملتی ہے۔ انہی میں ایک افسانہ "ممی" بھی ہے۔ اس افسانے کے مرکزی کردار کی بابت شکیل الرحمٰن کی رائے نقل ہے:

> "نفسیات کی ایک اصطلاح ہے 'Peacock wheel'، جب "ماں" کی شخصیت کے مختلف خوب صورت رنگوں اور خصوصاً محبت اور شفقت کی جانب اشارہ کیا جاتا ہے تو "پیکوک ویل" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ "ماں" مور کے پروں کے حسن وجمال کو لیے ہوتی ہے۔ اس کے کئی رنگ ہوتے ہیں اور رنگوں کی کئی جہتیں ہوتی ہیں۔ وہ زندہ اور متحرک نفسی قوت اور توانائی (psychic force) بھی ہے۔ اس کہانی میں ممی "پیکوک ویل" ہے۔ اپنے کئی رنگوں اور اپنی متحرک نفسی توانائی کے ساتھ سامنے آتی ہے۔" (۱)

"ممی" ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو سماج کی بھٹی میں پکتے ہوئے بہت سے افراد کو پرسکون رکھنے کے لیے ممتا کے جذبے سے بھرپور گھریلو ماحول فراہم کرتی ہے۔ ممی کے ہاں ان افراد میں مرد وزن کی اگرچہ تخصیص نہیں تاہم وہ اپنی چھت تلے کسی بھی قسم کی جسمانی تجارت کو نہ صرف یہ کہ ناپسند کرتی ہے بلکہ اس کی باقاعدہ مزمت بھی کرتی ہے۔ ممی کے پاس آنے والوں میں نوجوان لڑکے لڑکیوں کے علاوہ ادھیڑ عمر مرد وزن بھی شامل ہیں۔ یہ سب افراد آپس میں ہلا گلا کرتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں، گاتے ناچتے ہیں حتیٰ کہ ممی کے گھر سو جاتے ہیں تاہم ان کے مابین کسی قسم کا جنسی تعلق استوار نہیں ہوتا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ غیر قانونی جنسی تعلق معاشرے کے جبر کا ایک ردعمل ہے جبکہ ممی کے ہاں معاشرے کے اس دباؤ کو ختم کرنے کے لیے اور کئی عناصر موجود ہیں جن میں سب سے بڑھ کر ممتا کا جذبہ ہے اور پھر دوستی کا رشتہ ہے جو انسان کی اس حیوانی جبلت کو قدرے دبا دیتا ہے۔ ممی کے گھر میں اس قدر وسیع آمدورفت کو دیکھ کر علاقے کی پولیس کو شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہ کوئی قحبہ خانہ ہے اوراس امکان کی بنا پر ممی سے جنس کی دلالی کا مطالبہ کیا جاتا ہے جس پر ممی انکار کر دیتی ہے۔ اس انکار کی پاداش میں ممی کو شہر بدر کر دیا جاتا ہے اور ممی جنسی دلالی کے مقابلے میں اس

شہر بدری کو کھلے دل سے قبول کر لیتی ہے تاہم اس کے پروردہ لوگوں کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ "ممی" منٹو کا نسبتاً کم مشہور تاہم کامیاب افسانہ ہے۔ "ممی" اور کچھ دیگر افسانوں میں منٹو کے فن کی بابت ڈاکٹر فرزانہ اسلم رقم طراز ہیں:

> "منٹو محض عکاس حیات ہر گز نہیں۔ وہ مصور ہے، وہ فنکار ہے۔۔۔ منٹو نے بکثرت تخلیقی حقیقت نگاری کی ہے۔ "ہتک"، "موذیل"، "ممی"، "سڑک کے کنارے" صرف زندگی کی عکاسی یا فوٹو گرافی نہیں، ان افسانوں میں ترکیب جدید، تعمیر جدید اور تخلیق جدید ہے۔" (۲)

کہانی کے موضوع کی آفاقی نوعیت کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا انتخاب منٹو کے افسانوں کے انگریزی مترجمین نے بھی کیا۔ ترجمہ میں متنی ثقافت کا انتقال کماحقہ ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ زیر نظر مقالہ میں منٹو کے مذکورہ افسانے کے دو تراجم میں ثقافتی عناصر کی ترجمانی کا مطالعہ کیا جائے گا۔ ثقافتی عناصر کی ترجمانی کے حوالے سے ماہر ترجمہ ندا (E. A. Nida) کا خیال ملاحظہ ہو:

> " For truly successful translation, biculturalism is even more important than bilingualism, since words only have meanings in terms of the cultures in which they function" (۳)

ثقافتی عناصر کی ترجمہ کاری کے مطالعہ کے ضمن میں امریکی ماہر ترجمہ لارنس وینوتی (Lawrence Venuti) کے نظریات ترجمہ کو مد نظر رکھا جائے گا۔ لارنس وینوتی نے ثقافتی متن کی ترجمانی کے لیے ڈومیسٹی کیشن اور فارنائزیشن کی حکمت عملیاں پیش کیں۔ یہ حکمت عملیاں ترجمہ کے حوالے سے خاصی معروف ہیں اور بطور خاص ثقافتی متن کی ترجمہ کاری میں مستعمل ہیں، ثقافتی متن کی ترجمہ کاری کے حوالے سے ان کے استعمال کی وجہ ملاحظہ ہو:

> " Domestication and Foreignization are two concepts that have been widely adopted in discussions on translations,the obvious reason being that they can be applied to many of the traditional and fundamental ways of conceiving the essential aspect of translation the relationship between source and target text, the translator's choices,reader response and conflicting cultures" (۴)

ڈومیسٹی کیشن کی حکمت عملی ہدف متن سے قربت رکھتی ہے اور ماخذ متن سے قدرے فاصلے پر ہے۔ وینوتی نے اس کی توضیح ان الفاظ میں پیش کی ہے:

> "Domestication is defined in translation studies as a translation strategy in which a transparent, fluent style is adopted in order to minimize the strangeness of the foreign text for the target language reade" (۵)

اس حکمت عملی کی پہلی تکنیک Omission ہے جس کے تحت ہدف زبان میں ماخذ زبان کے لفظ کے مساوی متبادل نہ ہونے کی صورت میں ماخذ زبان کے لفظ کو اس طرح حذف کر دیا جاتا ہے کہ ترجمہ میں اصل متن کے معنی و مفہوم کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اس

حکمت عملی کی دوسری تکنیک Neutralization ہے جس کے تحت ماخذ متن کو لفظ بہ لفظ ترجمہ کرنے کی بجائے ہدف زبان کے عمومی الفاظ میں اس طرح ترجمہ کیا جاتا ہے کہ ظاہری الفاظ میں تبدیلی کے باوجود مفہوم میں تبدیلی واقع نہ ہو۔ تیسری تکنیک Cultural Substitution کی ہے جس کے تحت ماخذ زبان کے ثقافتی متن کی جگہ ہدف زبان میں مستعمل ثقافتی متبادل اختیار کیا جاتا ہے۔ چوتھی تکنیک Borrowing Global Text کہلاتی ہے جس کے تحت ماخذ متن میں مستعمل بین الاقوامی زبان کے الفاظ کا ترجمہ بین الاقوامی زبان میں ہی کیا جاتا ہے۔

ڈومیسٹی کیشن کے برعکس فارنائزیشن کی حکمت عملی میں ماخذ زبان کو مقدم رکھا جاتا ہے۔ فارنائزیشن کی توضیح ملاحظہ ہو:

> "Foreignization is a source-culture-oriented translation which strives to translate the source language and culture into the target one in order to keep a kind of exotic flavor"(۶)

اس حکمت عملی کی پہلی تکنیک Borrowing ہے جس کے تحت ماخذ زبان کا لفظ ترجمہ میں من وعن اپنالیا جا تا ہے ۔ یہ تکنیک اس وقت استعمال کی جاتی ہے جب مذکورہ لفظ کا متبادل ہدف زبان میں موجود تو ہوتا ہے لیکن اس لفظ کو اختیار کرنے سے متن کی سی تاثیر ترجمہ میں نہیں ملتی۔ اس حکمت عملی کی دوسری تکنیک Literal Translation یعنی لفظی ترجمہ کی تکنیک ہے جس کے تحت ماخذ متن کا لفظ بہ لفظ ترجمہ ہدف زبان میں کر دیا جاتا ہے۔ تیسری تکنیک Gloss کہلاتی ہے جو ناقابل ترجمہ الفاظ کے لیے مستعمل ہے اور جس کے تحت ماخذ متن کے ناقابل ترجمہ الفاظ من وعن ہدف زبان میں لکھ لیے جاتے ہیں۔

افسانہ "ممی" کے دو انگریزی تراجم ہو چکے ہیں۔ پہلا ترجمہ مدن گپتا نے کیا جو کاسموپلی کیشنز بھارت سے ۱۹۹۷ء میں Saadat Hasan Manto Selected Stories کے نام سے شائع ہوا۔ اس افسانے کا دوسرا انگریزی ترجمہ ریک میٹ اور آفتاب احمد کی مشترکہ کاوش ہے اور یہ دوسرا ترجمہ Saadat Hassan Manto Bombay Stories کے عنوان سے ونٹاج بکس نیویارک سے ۲۰۱۴ء میں شائع ہوا۔ زیر تسطیر مقالے میں ان دونوں تراجم کا تقابلی مطالعہ لارنس وینوتی کے نظریات ترجمہ کی روشنی میں پیش ہے۔

افسانہ "ممی" کی کہانی منٹو کے قلم سے واحد متکلم کے صیغے میں لکھی گئی ہے اور منٹو خود اس افسانے کا ایک متحرک کردار ہے۔ اپنے ہی افسانوں میں منٹو کا بطور کردار سامنے آنا اس بات کی دلیل ہے کہ منٹو کے افسانے صرف ظاہری مشاہدے پر استوار نہیں بلکہ وہ خود اپنے افسانوں کے کرداروں سے تعامل کرتے ہیں۔ اس کی توثیق شمیم حنفی کے اس قول سے ہوتی ہے:

> "اپنے کرداروں کے باطن تک منٹو کی رسائی محض ذہن کے وسیلے سے نہیں ہوتی ورنہ اس کے افسانے کیس ہسٹریز بن جاتے اور اس طرح صرف ایک سماجیاتی مطالعے کے موضوع کی حیثیت اختیار کر لیتے۔" (۷)

گویا منٹو کا خود افسانے کا کردار ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے صرف ذہن کے وسیلے سے افسانے کے کرداروں کے باطن تک رسائی حاصل نہیں کی بلکہ ان کرداروں سے ان کا حقیقی تعلق ہی افسانے کی اصل ہے۔ افسانے کا ابتدائی مکالمہ مع ترجمہ ملاحظہ ہو:

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

"نام اس کا مسز سٹیلا جیکسن تھا مگر سب اسے ممی کہتے تھے۔ درمیانے قد کی ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ اس کا خاوند جیکسن پچھلی سے پچھلی جنگ عظیم میں مارا گیا تھا۔ اس کی پنشن سٹیلا کو قریب قریب دس برس سے مل رہی تھی۔"(۸)

"Her name was Mrs. Stela Jackson, but everyone called her Mummy. She was a middle-aged woman of average height. Her husband Jackson had got killed in the First World War. For the last ten years Stela was getting his pension"(۹)

"Her name was Mrs. Stella Jackson but everyone called her Mummy. She was middle-aged and of average height. Her husband had been killed in the First World War, and she had been getting his pension for about ten years" (۱۰)

پہلے ترجمہ میں پہلے دو جملوں کا لفظی ترجمہ کیا گیا ہے۔ "سٹیلا جیکسن" کے نام کے لیے گلوز کی تکنیک برتی گئی ہے۔ تیسرے جملہ میں لفظی ترجمہ کے ساتھ ساتھ "جیکسن" کے لیے گلوز جبکہ "پچھلی جنگ عظیم" کی ترجمانی کے لیے نیوٹرل تکنیک برتی گئی ہے۔ چوتھے جملے میں مذکور "قریب قریب دس برس" کا ترجمہ کچھ اختلاف کا حامل ہے۔ متن میں امکانی کیفیت یعنی "قریب قریب" کو ترجمہ میں پچھلے دس برس کی صورت مطلق کیفیت میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ "پنشن" کے لیے بمطابق ضرورت گلوبل ٹیکسٹ مستعار لیا گیا ہے۔ دوسرا ترجمہ پہلے ترجمہ سے قربت رکھتا ہے۔ "پچھلی جنگ عظیم" کی ترجمانی کی مثال دیکھی جا سکتی ہے کہ جس کے لیے پہلے ترجمہ کی مثل دوسرے ترجمہ میں بھی نیوٹرل تکنیک برتی گئی ہے۔ مفہوم کی مجموعی نمائندگی میں پہلا ترجمہ ایک خفیف اختلاف کے باوجود کامیاب ہے، دوسرے ترجمہ میں یہ خفیف اختلاف البتہ واقع نہیں۔ میٹ ریک اور آفتاب احمد نے "قریب قریب دس برس" کی ترجمانی کرتے ہوئے for about کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے متن کی امکانی کیفیت کو ترجمہ میں بھی امکانی ہی رکھا ہے۔ دونوں تراجم میں تکنیک ایک ہی ہے، قواعد میں البتہ معمولی فرق ہے جو اختیاری دائرے کے اندر درست ہے اور متن کی تفہیم پر اثر انداز نہیں۔

ممی کے بارے میں کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ پونا کب کیسے اور کہاں سے آئی؟ اس کی ذات بجائے خود اس قدر پر کشش تھی کہ اس کے ملنے والوں نے کبھی ان سوالات کو کھوجنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ منٹو کے تمام دوستوں کے وجود پر ممی کی ذات کا اثر واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا تھا۔ منٹو کی ممی سے ملاقات اس کے دوست چڈہ کے توسط سے ہوئی۔ پربھات نگر جانے سے قبل منٹو کا اپنی بیوی کے ہمراہ پونا آنا ہوا، تانگے میں سواری کے دوران منٹو کو ایک اور تانگے میں چڈہ ایک عورت (ممی) کے ہمراہ نظر آیا۔ احوال مع ترجمہ ملاحظہ ہو:

"میں چونک پڑا۔ چڈہ تھا۔ ایک گھسی ہوئی میم کے ساتھ۔ دونوں ساتھ ساتھ جڑ کے بیٹھے تھے۔ میرا پہلا رد عمل انتہائی افسوس کا تھا کہ چڈے کی جمالیاتی حس کہاں گئی جو ایسی لال لگامی کے ساتھ بیٹھا ہے۔ عمر کا ٹھیک اندازہ تو میں نے اس وقت نہیں کیا تھا مگر

اس عورت کی جُھریاں پاؤڈر اور روج کی تہوں میں سے بھی صاف نظر آ رہی تھی۔ اتنا شوخ میک اپ تھا کہ بصارت کو سخت کوفت ہوتی تھی۔" (۱۱)

"It was Chaddha. With him sat an aging European woman. My first reaction was that the man must have lost all aesthetic sense to be in the company of an old hag like her. I could not guess her age but her wrinkles were clearly visible under the very coat of rouge and powder she had on her face. The make-up was gaudy and offensive"(۱۲)

"I was startled. It was Chaddah and a haggard white woman sitti ng thigh to thigh. My first reaction was one of great disappointment. What was Chaddah thinking? Why was he sitting next to such a trashy old hag? I couldn't guess her exact age, but her gaudy layers of powder and rouge couldn't cover up her wrinkles. All in all, it was a depressing sight"(۱۳)

پہلے ترجمہ میں "میں چونک پڑا" کو مکمل طور پر حذف کر دیا گیا ہے۔ "گھسی ہوئی میم" کے لیے European mam کی ترکیب مناسب نہیں۔ "میم" کے لیے ضروری نہیں کہ یورپی نسل ہی ہو، اصلاً یہ ایک تعظیمی تخاطب ہے، پھر یہ کہ نو آبادیاتی عہد میں اگرچہ برصغیر میں اس سے مراد انگریز خاتون ہی لی جاتی ہے تاہم یہ کوئی حتمی کلیہ نہیں کہ "میم" کوئی یورپی عورت ہی ہو۔ بہر طور یہ ترجمہ نیوٹرل کے زمرے میں آتا ہے۔ "گھسی ہوئی" کے لیے aging کی صورت میں بھی نیوٹرلائزیشن کی تکنیک برتی گئی ہے۔ "دونوں ساتھ ساتھ جڑ کر بیٹھے تھے" کی صورت حال ترجمہ میں مکمل طور پر حذف کر دی گئی ہے۔ اسی طرح ردعمل سے "افسوس" کا پہلو بھی ترجمانی کے دوران حذف کر دیا گیا ہے۔ "لال لگامی" کے لیے old hag کے الفاظ مناسب متبادل نہیں۔ اگلے جملے میں لفظی ترجمہ کی تکنیک خوبی سے برتی گئی ہے۔ آخری جملہ کے ترجمہ میں نیوٹرلائزیشن کی تکنیک مستعمل ہے۔

متن کے دوسرے ترجمہ کے آغاز میں لفظی ترجمہ کی تکنیک کو برتا گیا ہے۔ "میم" کی ترجمانی یہاں بھی نو آبادیاتی عہد کے تناظر میں کی گئی ہے۔ "گھسی ہوئی" کی ترجمانی عمدہ ہے۔ ساتھ ساتھ جڑ کے بیٹھنے کے لیے thigh to thigh کی صورت cultural substitution کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ "جمالیاتی حس" کی ترجمانی انتہائی ناقص ہے، متن کا مدعا خواہ مخواہ حذف کر کے عمومی جملہ بندی کی گئی ہے۔ "لال لگامی" کی ترجمانی یہاں بھی پہلے ترجمہ کی مثل نامناسب ہے، trashy کے استزاد کے ساتھ البتہ درون متن کیفیت کی توضیح کی گئی ہے۔ اگلے جملے کی ترجمانی میں لفظی ترجمہ کی تکنیک مستعمل ہے جبکہ آخری جملے کے ترجمہ میں نیوٹرلائزیشن کی تکنیک استعمال ہوئی ہے۔ پہلے ترجمہ میں بھی آخری دو جملوں کی ترجمانی انہی خطوط پر ہے تاہم قواعد کا خفیف اختلاف واقع ہے جو متن کے مفہوم پر بہر حال اثر انداز نہیں۔

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلہ
دریافت

ایک عرصہ بعد منٹو اور چڈہ کی ملاقات ہو رہی تھی۔ دونوں میں خاصی بے تکلفی تھی۔ منٹو کی بیوی کو چڈہ کچھ خاص پسند نہیں تھا۔ چڈہ انہیں ساتھ لے جانا چاہتا تھا، منٹو کی بھی یہی منشا تھی، منٹو کی بیگم کو نہ چاہتے ہوئے بھی رضامند ہونا پڑا۔ چڈہ منٹو کو اپنے مکان کی طرف بھیج کر خود ممی کے ساتھ چلا گیا تھا۔ چڈہ کا مکان کچھ خاص صاف یا آراستہ نہ تھا۔ ایسے میں منٹو کو جو خیال آیا، ترجمہ کے ساتھ ملاحظہ ہو:

> "مجھے اس کا پورا احساس تھا کہ وہ عورت جو بیوی ہو، ایسے گندے ماحول میں یقیناً پریشانی اور گھٹن محسوس کرے گی، مگر میں نے یہ سوچا تھا کہ چڈہ آ جائے تو اس کے ساتھ ہی پربھات نگر چلیں گے۔ وہاں جو میرا فلموں کا پرانا ساتھی رہتا تھا، اس کی بیوی اور بال بچے بھی تھے۔ وہاں کے ماحول میں میری بیوی قہر درویش بر جان درویش دو تین دن گزار سکتی تھی۔" (۱۴)

> "I was fully conscious that a woman who is a wife would feel out of place and unhappy in such bad surroundings. Therefore I awaited Chaddha's arrival so that we may move over to our friend in wife and children"(۱۵)

> "I knew my wife was sure to feel uncomfortable in that drab setting, but I imagined that once Chaddah came, we would all go to Parbh at Nagar to my old film buddy's and then my wife, poor thing, could spend two or three days there with his wife and children" (۱۶)

مذکورہ متن کے پہلے ترجمہ کا پہلا جملہ دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اگرچہ لفظی ترجمہ کی تکنیک مستعمل ہے تاہم "پریشانی" کے لیے out of place کے الفاظ قابل قبول نہیں۔ اگلے دو جملوں کی ترجمانی کے لیے نیوٹرلائزیشن کی تکنیک استعمال کرتے ہوئے کچھ متنی تناظرات کو حذف کر دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر "فلموں کا پرانا ساتھی" ترجمہ میں فقط دوست بن کے سامنے آتا ہے۔ "چڈہ" اور "پربھات نگر" کے لیے بمطابق ضرورت گلوز مستعمل ہے۔ اس متن کی ترجمانی کا اصل جوہر "قہر درویش بر جان درویش" کے ترجمہ میں مضمر ہے کیونکہ یہاں cultural substitution اپنانے کی ضرورت ہے جس کے انتخاب سے مترجم کے فن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پہلے ترجمہ میں مترجم نے اس ضرب المثل کو سرے سے حذف کر دیا ہے جس سے مترجم کی کور بصری صاف آشکار ہے۔ متن کا دوسرا ترجمہ بھی پہلے ترجمہ کے قریب قریب ہے جس میں لفظی ترجمہ کی تکنیک غالب ہے جبکہ جزوی طور پر ضرورت کے مطابق گلوز اور نیوٹرلائزیشن کو بھی برتا گیا ہے۔ پہلے ترجمہ کے برعکس دوسرے ترجمہ میں واضح حذف موجود نہیں۔ دوسرے ترجمہ میں ضرب المثل کو نیوٹرل تکنیک کے تحت ترجمہ تو کیا گیا ہے لیکن اس سے متن کا سا مزہ ترجمہ میں نہیں ملتا۔ "قہر درویش بر جان درویش" کی عکاسی poor thing کے الفاظ سے کسی طور نہیں ہو سکتی۔

مکان پہ چڈہ کا نوکر موجود تھا، عجب مگن شخص تھا۔ پانی پلانے کے لیے گلاس نہ تھا، آخر ایک ٹوٹا ہوا مگ بمشکل ڈھونڈا کہ مہمانوں کو پانی پلایا جائے۔ منٹو کی بیوی نے اس کپ میں پانی پینے سے معذرت کر لی۔ منٹو چڈہ کے پلنگ پر بیٹھا تھا۔ بیوی کا احوال مع ترجمہ ملاحظہ ہو:

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

"اس سے کچھ دور ہٹ کر دو آرام کرسیاں تھیں۔ ان میں سے ایک پر میری بیوی بیٹھی پہلو بدل رہی تھی۔ "(۱۷)

"My wife sat in one of the two arm-chairs in the room" (۱۸)
"On the other side of the room were two easy chairs, and my wife ww was sitting in one and fidgeting"(۱۹)

پہلے ترجمہ میں نیوٹرلائزیشن کی تکنیک کو استعمال کرتے ہوئے ایک ہی جملے میں کچھ حذوف کے ساتھ متن کے دونوں جملے سمو دیے گئے ہیں۔ دوسرے ترجمہ میں لفظی ترجمہ کی تکنیک استعمال کی گئی ہے اور یہاں کسی قسم کا حذف یا استزاد دیکھنے میں نہیں آتا۔ "پہلو بدلنا" کو پہلے ترجمہ میں حذف کر دیا گیا ہے جبکہ دوسرے ترجمہ میں اس کے لیے نیوٹرلائزیشن کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ اس اعتبار سے دوسرا ترجمہ پہلے ترجمہ کی نسبت عمدہ ہے۔

اسی اثنا میں چڈہ کی واپسی ہوئی، مہمان نوازی کے اعتبار سے وہ بھی اپنے ملازم کی طرح بے نیاز ہی تھا۔ اس نے منٹو کی بیوی سے دو چار باتیں کیں اور منٹو کو ساتھ لیے باہر چلا گیا۔ منٹو کا خیال تھا کہ اس کی بیوی خود ہی کڑھ کڑھ کے سو جائے گی۔ یہی ہوا، چڈہ اور منٹو کی واپسی ہوئی تو منٹو کی بیوی محو نوم تھی۔ چڈہ کے گھر میں عجب تکدر تھا، اس پہ چڈہ کا پیگ پہ پیگ چڑھانا مستزاد، اس کا ملازم لائے جاتا اور چڈہ چڑھائے جاتا۔ ملازم کے ساتھ تعلق کا یہ عالم تھا کہ چڈہ کبھی اسے ایک ملک کا شہزادہ بنا دیتا اور کبھی دوسرے کا۔ چڈہ منٹو کی بیوی کے بارے میں متفکر ضرور تھا کہ وہ کیونکر اس ماحول میں وقت گزار پائے گی۔ خود چڈہ بیوی کے تکلف سے پاک تھا کیونکہ وہ خود کو اس بندھن کے لائق نہ سمجھتا تھا، تاہم اپنے دوستوں کی بیویوں کی راحت کا اسے اسی لیے خیال رہتا کہ بیوی ایک نازک اور نفیس رشتہ ہوتا ہے، اسے پورا پروٹوکول دینا اس کے شوہر اور جملہ احباب پر واجب ہے۔ قطع نظر اس سوچ کے، رم کا دور چلا۔ رات جیسے تیسے گز رگئی۔ صبح دم چڈہ نے نوکر کے ہاتھ ممی کے گھر سے چائے منگوائی۔ چڈہ کے گھر کی روایت کے برخلاف ممی کے گھر سے آنے والی چائے بہت سلیقے اور نفاست کا مظہر تھی اس لیے منٹو کی بیوی نے خوشدلی سے دو پیالیاں پی لیں۔ اس کے بعد پربھات نگر جانے کے لیے تانگہ منگوایا گیا۔ وہاں منٹو کے دوست ہریش کے گھر جانا ہوا جو خود تو گھر پہ نہیں تھا تاہم منٹو کی بیوی کو ہریش کی بیوی کے سپرد کر دیا گیا۔ چڈہ نے اس موقع پر جو بیان دیا، ترجمہ کے ساتھ ملاحظہ ہو:

"خربوزہ، خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔ بیوی، بیوی کو دیکھ کر رنگ پکڑتی ہے۔ "(۲۰)

"Likes should be with likes "(۲۱)
"Wives prefer their own company. When we come back, we'll see how you two ladies got along"(۲۲)

مذکورہ بالا متن کے پہلے جملے میں ثقافتی عنصر مستعمل ہے۔ پہلے ترجمہ میں اس کے لیے نیوٹرل تکنیک استعمال کی گئی ہے جس سے مفہوم کی ترسیل تو ہو رہی ہے تاہم یہاں cultural substitution کی تکنیک استعمال کرنا زیادہ مناسب ہے۔ دوسرے جملے

کو مکمل طور پر حذف کر دیا گیا ہے۔ دوسرے ترجمہ میں متن کے پہلے جملے میں مستعمل ثقافتی عنصر کو مکمل طور پر حذف کر دیا گیا ہے جبکہ دوسرے جملے کو خواہ مخواہ کے زوائد کا چولا پہنا کر پیش کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر متن کے اس حصے کے دونوں ترجمے ناقص ہیں۔

چڈہ نے منٹو کی بیوی کو یقین دلایا کہ وہ منٹو کے ساتھ ہر یش سے ملنے اسٹوڈیو جارہا ہے۔ یہ اور بات کہ وہ منٹو کو لیے سعیدہ کاٹیج جانکلا جہاں انڈسٹری سے وابستہ کئی افراد رہائش پذیر تھے۔ ایک حصہ چڈہ کے پاس تھا۔ کچھ افراد کا احوال مع ترجمہ ملاحظہ ہو:

"غریب نواز۔۔۔ ادبِ لطیف قسم کی عمارت میں فلمی کہانیاں لکھنا اس کا شُغل تھا۔ کبھی کبھی شعر بھی موزوں کر لیتا تھا۔ کاٹیج کا ہر شخص اس کا مقروض تھا۔ شکیل اور عقیل دو بھائی تھے۔ دونوں کسی اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے اسسٹنٹ تھے اور بر عکس نام نہند نامِ زنگی باکافور کی ضرب المثال کے ابطال کی کوشش میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔" (۲۳)

"Gareeb Nawaz... His profession was to write stories in a literary ww style. Sometimes he even wrote poetry. Everyone in the cottage owed him money. Shakeel and Aqeel were two brothers. Both were Assistants to some Assistant Director. Both used to keep busy doing nothing" (۲۴)

"Gareeb Nawaz ....He wrote romances for the film company ,and sometimes he tried his hand at poetry. Everyone who lived in the Cottage had an outstanding debt with him .There were also the bro thers, Shakil and Aqil. Both were assistants to some assistant dir ector and always wrapped up in impossible scheme"(۲۵)

متن کے پہلے ترجمہ میں "غریب نواز"، "شکیل" اور "عقیل" کے لیے گلوز مستعمل ہے۔ متن کے دوسرے جملے کے ترجمہ میں نیوٹرل تکنیک استعمال کی گئی ہے جس کی وجہ سے "ادب لطیف قسم کی عمارت" کا تصور ترجمہ میں موجود نہیں۔ یہاں اس عمارت کا تصور دینا بہر حال ضروری تھا کیونکہ یہ متن کی مرکزی عمارت یعنی "سعیدہ کاٹیج" کی جانب اشارہ ہے۔ شعر موزوں کرنے کی ترجمانی کے لیے بھی نیوٹرل تکنیک برتی گئی ہے جبکہ اگلے دو جملوں کے لیے لفظی ترجمہ کی تکنیک مستعمل ہے۔ آخری جملے کے پہلے حصے کا ترجمہ لفظی اور دوسرے حصے کا ترجمہ نیوٹرل ہے۔ متن کے دوسرے ترجمہ بھی تھوڑی بہت لفظی تبدیلیوں کے ساتھ ترتیب وار یہی تکنیکیں مستعمل ہیں۔ دونوں ترجموں میں "ادب لطیف قسم کی عمارت" کا حذف متن و ترجمہ میں عدم ہم آہنگی کا اظہار ہے۔

چڈہ نے اس دن کا نشہ پورا کیا اور منٹو سے مخاطب ہوا، مکالمہ و ترجمہ ملاحظہ ہو:

"یار، بھابھی کو تم خواہ مخواہ یہاں لائے۔ خدا کی قسم مجھے اپنے سینے پر ایک بوجھ سا محسوس ہو رہا ہے۔"

پھر اس نے خود ہی اپنے آپ کو تسکین دی۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ بور نہیں ہوں گی وہاں؟"

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

میں نے کہا۔ "ہاں وہاں رہ کر وہ میرے قتل کا فوری ارادہ نہیں کر سکتی"

اور میں نے اپنے گلاس میں رم ڈالی جس کا ذائقہ بُسے ہوئے گڑ کی طرح تھا۔ "(۲۶)

"You have brought Bhabi unnecessarily here." Then by way of consoling himself he added, "But there she may not be bored. I said, "Staying there she will not be able to make plans for my murder." And I poured more rum into my glass"(۲۷)

"Hey, you shouldn't have dragged Bhabhi here. I swear, it's a big responsibility! But then he comforted himself. I don't think she'll get bored where we left her. "Yes, I answered, 'she's okay over there. For the time being she'll forget about wanting to kill me. Then I poured some rum into my glass even though the stuff tasted like rotten molasses"(۲۸)

متن کے پہلے ترجمہ میں کچھ حذوف وزوائد کے ساتھ لفظی تکنیک غالب ہے۔ "بھابھی" کے لیے لفظی متبادل موجود ہونے کے باوجود مستعار لفظی کی تکنیک اختیار کی گئی ہے جو معقول فعل ہے کیونکہ اس رشتے کی جتنی اہمیت متنی تہذیب میں ہے، ہدف زبان کی تہذیب میں نہیں۔ اس لیے مستعار لفظی کی بدولت اس لفظ سے وابستہ تمام مفاہیم ترجمہ میں بخوبی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ متن کے دوسرے جملے کو ترجمہ میں مکمل طور پر حذف کر دیا گیا ہے حالانکہ متن کا یہ حصہ قابلِ ترجمہ ہے۔ "سینے پر بوجھ محسوس ہونا" جیسے ثقافتی عنصر کو حذف کر دیا گیا ہے۔ "بور"، "گلاس" اور "رم" کے لیے بمطابق ضرورت گلوبل ٹیکسٹ استعمال کیا گیا ہے۔ آخری جملے میں موجود "بسے ہوئے گڑ" کے ذائقے کو ترجمہ میں شامل نہیں کیا گیا حالانکہ یہ متنی تہذیب کا خاص ذائقہ ہے جسے ماخذ زبان کے پروردگان ہدف تہذیب کی شرابوں میں بھی محسوس کر لیتے ہیں۔

متن کے دوسرے ترجمہ کو دیکھیں تو پہلا جملہ لفظی اور نیوٹرل ترجمہ کا امتزاج ہے تاہم یہاں dragged کا لفظ مناسب نہیں۔ "بھابھی" کے لیے یہاں بھی مستعار لفظی کی تکنیک مستعمل ہے۔ "سینے پر بوجھ محسوس ہونا" کے لیے نیوٹرل تکنیک مستعمل ہے۔ اگلے تمام جملوں کے ترجمہ میں کچھ کمی بیشی کے ساتھ لفظی تکنیک مستعمل ہے جبکہ گلوبل ٹیکسٹ بھی بقدرِ ضرورت مستعمل ہے۔ "بسے ہوئے گڑ" کا ترجمہ عمدہ ہے۔

نشے میں دھت چڈہ نے ممی کے ہاں ملنے والی ایک لڑکی فی لس کا قصیدہ بآواز بلند پڑھنا شروع کیا، ترجمے کے ساتھ پیش ہے:

" یار۔۔۔ میں واقعی جذباتی ہو گیا ہوں۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہ رنگ۔۔۔ خدا کی قسم لاجواب ر
نگ ہے۔۔۔ وہ تم نے دیکھا ہے۔۔۔ وہ جو مچھلیوں کے پیٹ پر ہوتا ہے۔۔۔ نہیں نہیں
ہر جگہ ہوتا ہے۔۔۔ پومفریٹ مچھلی۔۔۔ اس کے وہ کیا ہوتے ہیں۔۔۔؟ نہیں
نہیں۔۔۔ سانپوں کے۔۔۔ وہ ننھے ننھے کھپرے۔۔۔ ہاں کھپرے۔۔۔ بس ان کا ر
نگ۔۔۔ کھپرے۔۔۔ یہ لفظ مجھے ایک ہندستوڑے نے بتایا تھا۔۔۔ اتنی خوب صور

ت چیز اور ایسا واہیات نام۔۔۔پنجابی میں ہم انھیں چانے کہتے ہیں۔اس لفظ میں چنچنہا
ہٹ ہے۔۔۔وہی۔۔۔بالکل وہی جو اس کے بالوں میں ہے۔۔۔لٹیں ننھی ننھی سنپولیا
ں معلوم ہوتی ہیں جو لوٹ لگا رہی ہوں۔۔۔"وہ ایک دم اٹھا۔"سنپولیوں کی ایسی تیسی،
میں جذباتی ہو گیا ہوں۔" (۲۹)

"I have really become sentimental friend... yes... that colour... it is really heavenly. Have you even seen the colour on the belly of fish.... it is all over them... pomfret fish... what are its those things called no no... those little things of snakes which in Urdu they call 'khapday'... such beautiful things and such an ugly name for them....in Panjabi we call them 'chaane'.... what perkishness in this word... the same sort that her hair have... tresses looking like small dangling snakes... ". He got up. "To hell with small dangling snakes... I have become sentimenta" (۳۰)

"Man, I have really become emotional! Yes that colour-I swear to God it's unprecedented. Have you seen it? You'll find it on a fish's stomach-no, no, not just their stomachs on pomfret fish-what are those things on fish called? No, no on snakes. on their delicate scales yes, scales just that colour - scales - I learned that word from a fisherman. It's such a beautiful thing and yet such an absurd word! In Punjabi we call it chane'- shining-yes, tha t-it's exactly how her hair is. Her hair is so beautiful, it could kill you!' Then he suddenly got up. 'Fuck all this! Man, I've got all emotional" (۳۲)

مذکورہ متن کے پہلے ترجمہ کے آغاز میں لفظی ترجمہ کی تکنیک استعمال کی گئی ہے جس کا تسلسل "لاجواب" کے لیے heavenly کے لفظ پر آکر ٹوٹتا ہے۔اس لفظ کا انتخاب نیوٹرل تکنیک کے زمرے میں آتا ہے۔اگلے دو جملوں کی ترجمانی میں بھی یہی دو تکنیکیں یکے بعد دیگرے مستعمل ہیں۔"پومفریٹ" کیلق کی مثال ہے جس کے لیے ترجمہ میں اس لفظ کا اصل ماخذ یعنی pomfret مستعمل ہے۔مچھلی اور سانپوں کے "کھپرے" تفہیمی سطح پر کچھ کمی بیشی کے ساتھ ترجمہ میں درست جگہ پاتے ہیں تاہم ان کے لیے which in Urdu they call 'khapday' کا مذکور مناسب نہیں کیونکہ متن بجائے خود اردو میں ہی ہے اور اس میں یہ ذکر کہیں بھی نہیں کہ یہ لفظ "اردو" میں کھپرے کہلاتا ہے۔پھر "کھپرے" کے لیے نقل حرفی کے ہجے بھی درست نہیں۔"ہندستوڑے" کا تذکرہ مکمل طور پر حذف کر دیا گیا ہے۔"کھپرے" کا واہیات پن بھی محذوف ہے۔پنجابی میں ان کے مذکور کا ترجمہ البتہ درست ہے اور "چانے" کے لیے گلوز مستعمل ہے۔سانپ زلفوں کا ترجمہ بھی اچھا ہے۔

متن کے دوسرے ترجمہ میں لفظی ترجمہ کی تکنیک غالب ہے۔"لاجواب" کی ترجمانی کے لیے unprecedented کا لفظ عمدہ ہے۔ متن کا اصل مدعا یعنی "کھپرے" کے لیے scales کا لفظ مستعمل ہے۔"پو مغریٹ" کے لیے کیلق کا اصول جبکہ "چانے" کے لیے گلوز استعمال کیا گیا ہے۔

نشہ خوب چڑھا تو چڈہ نے گانا شروع کر دیا۔فی لس صرف چڈہ کے ہی نہیں بلکہ سعیدہ کاٹیج کے دیگر مکینوں خاص طور پر ساز نواز ون کترے کے حواسوں پر بھی سوار تھی۔ ہر ایک کو لگتا تھا کہ اس میں فی لس کو متاثر کرنے کی صلاحیت ہے۔ایک مثال مع ترجمہ ملاحظہ ہو:

"ون کترے کا بزعمِ خود یہ خیال تھا کہ اس کی پٹی سن کر وہ پری ضرور شیشے میں اتر آئے گی۔" (۳۲)

"Venkutre's confidence was his music will sway her in his favour"(۳۳)

"Vankatre was sure his singing would be enough to win her". (۳۴)

متن کے اس حصے کے دونوں ترجمے نیوٹرل تکنیک کا مظہر ہیں۔"ون کترے" کے لیے گلوز مستعمل ہے۔ "پٹی" کا مذکور اس تکنیک کی نذر ہو گیا ہے جس کی وجہ سے متن کی ثقافت ترجمہ میں نظر نہیں آتی۔پہلے ترجمہ کے قواعد میں اختلاف ہے، was کے ساتھ will کا استعمال مناسب نہیں۔دوسرے ترجمہ میں البتہ ایسی کوئی غلطی نہیں۔ابھی یہ مضمون جانے کتنا طول پکڑ تا کہ چڈہ نے دفعتاً گھڑی دیکھی اور چیختے ہوئے منٹو سے مخاطب ہوا:

"جہنم میں جائے یہ لونڈیا۔۔۔ چلو یار۔۔۔ بھابی وہاں کباب ہو رہی ہو گی۔۔۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ میں کہیں وہاں بھی سنٹی مینٹل نہ ہو جاؤں۔۔۔ خیر۔۔۔ تم مجھے سنبھال لینا۔" (۳۵)

"To hell with this girl.... Let's go... Your wife must be a ball of fire by now... But the trouble is that I am not sure that I will not become sentimental there also... Anyhow you take care of that"(۳۶)

"To hell with this girl! Let's go, your wife's probably geting upset over there. The only problem is I might get sentimental there too. Well, look after me, will you?" (۳۷)

متن کے پہلے ترجمہ میں لفظی ترجمہ کی تکنیک غالب ہے۔"کباب ہونا" کا ترجمہ البتہ نیوٹرل ہے تاہم خوب ہے۔اس کے لیے یوں تو cultural substitution کی تکنیک موزوں ہے تاہم یہاں نیوٹرل کی ذیل میں بھی اسی انتخاب کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ "سینٹی مینٹل" کے لیے گلوبل ٹیکسٹ مستعار لیا گیا ہے۔ترجمہ میں اس کیفیت سے متعلقہ جملہ بندی میں کچھ جھول ہے۔امکانی صورت حال کو مطلق بیان کیا گیا ہے۔ I am not sure مطلق بیان ہے جبکہ متن امکانی ہے۔دوسرے ترجمہ میں بھی زیادہ تر لفظی ترجمہ کی تکنیک ہی مستعمل ہے۔یہاں بھی "کباب ہونا" کا ترجمہ نیوٹرل ہے تاہم پہلے ترجمہ میں کباب ہونے کے نسبت یہاں نیوٹرلائزیشن کے تحت اس محاورے سے جڑی ہوئی معنویت میں کافی تخفیف کر دی گئی ہے۔"سینٹی مینٹل" کے لیے یہاں بھی بمطابق ضرورت گلوبل

ٹیکسٹ مستعار لیا گیا ہے اور ترجمہ میں اس سے وابستہ امکانی کیفیت کو بھی بخوبی منتقل کیا گیا ہے۔ متن کے آخری جملے کو البتہ ترجمہ میں استفہام میں بدل دیا گیا ہے حالانکہ متن میں یہ جملہ مطلق ہے۔

آخر تانگہ منگوا کر منٹو کی بیوی کی طرف جایا گیا۔ ہریش کے گھر میں چڈہ نے آنکھ کے اشارے سے ہریش کو سب کچھ سمجھا دیا۔ ہریش کی منشا کے مطابق ہریش کی بیوی نے منٹو کی بیوی کو اگلے روز شوٹنگ پر لے جانے کا وعدہ کیا اور خواتین کو باتوں میں بہلا کر سب باہر آ گئے۔ منٹو کی زبانی بیوی کا حال مع ترجمہ ملاحظہ ہو:

"میری سادہ لوح بیوی جال میں پھنس چکی تھی۔" (۳۸)

"My wife could not fathom the clever move of my friends"(۳۹)

"My naïve wife was caught in the trap"(۴۰)

متن کا پہلا ترجمہ نیوٹرل ہے۔ بیوی کی سادہ لوحی کو حذف کر دیا گیا ہے جبکہ دوست کا ذکر مستزاد ہے۔ دوست کی عیاری کو ماپنے کے لیے fathom کا پیمانہ متعارف کروایا گیا ہے۔ اس لفظ کا ایک معنی سمجھ بوجھ کا ہے تاہم اس کا معروف معنی پانی کی گہرائی ماپنے کی اکائی کا ہے جو چھ فٹ کے مساوی ہے۔ ترجمہ میں نیوٹرلائزیشن کی مد میں متن کا مفہوم تو سمجھ میں آ رہا ہے لیکن یہ سمجھ سے بالا ہے کہ مصنف کو یہاں یہ تکنیک کیوں اپنانی پڑی جبکہ اس حصے کا لفظی ترجمہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر نیوٹرلائزیشن کی تکنیک اپنا ہی لی تو کیا fathom جیسے ذو معنی لفظ کا استعمال لازم تھا؟ بہتر ہوتا اگر یہاں سادہ الفاظ استعمال کیے جاتے تاکہ متن اور ترجمہ کی کچھ قربت قائم رہتی۔ متن کا دوسرا ترجمہ لفظی ہے اور یہ پہلے ترجمہ سے بہت اچھا ہے۔ اس میں نہ صرف ساری جزئیات کو سمویا گیا ہے بلکہ "جال میں پھنسنا" جیسے خیال کی بھی عمدہ ترجمانی کی گئی ہے۔

باہر نکلتے ہی ہریش کو چھوڑ چڈہ منٹو کو لے کر ممی کی طرف روانہ ہو گیا جہاں باقی دوستوں کی بھی آمد تھی۔ ممی کا گھر بہت نفیس تھا، خود ممی البتہ انتہائی شوخ، میک اپ میں لتھڑی ہوئی تھیں۔ آج فی لس کی آمد متوقع تھی۔ چڈہ کو زعم تھا کہ میدان وہی مارے گا کیونکہ وہ خاصا قبول صورت تھا، تاہم اس نے دوسروں کو بھی دعوت دی جسے پسند نہ کیا گیا۔ کچھ ہی دیر میں چار پانچ رنگ برنگ لڑکیاں وہاں آ گئیں اور یوں گھل مل بیٹھیں جیسے معمول کی بیٹھک ہو۔ چڈے نے فی لس کو ہلکا سا نشہ پلایا، یہ پہلا موقع تھا اس لیے فی لس کے لیے سہارنا آسان نہ تھا۔ تاہم چڈہ نے یہ جرات علی الاعلان کی تھی۔ ممی کی خاطر داری کا مذکور مع ترجمہ ملاحظہ ہو:

"ممی اس وقت اندر باورچی خانے میں پوٹیٹو چپس تل رہی تھی۔۔۔" (۴۱)

"Mummy was in the kitchen at that time frying potato-chips"(۴۲)

"Mummy went into the kitchen to fry some potato chips"(۴۳)

متن کے دونوں ترجمے لفظی ہیں۔ دوسرے ترجمہ میں قواعد کا خفیف سا اختلاف موجود ہے، متن میں فعل ماضی جاری جبکہ ترجمہ میں ماضی مطلق مستعمل ہے۔ علاوہ ازیں دونوں ترجمے متن کے از حد قریب ہیں۔ "ممی" اور "پوٹیٹو چپس" کے لیے بقدر ضرورت گلوبل ٹیکسٹ مستعار لیا گیا ہے جبکہ باقی متن میں لفظی مساوی جملہ بندی کو اپنایا گیا ہے۔

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

فی لس کانشہ اگرچہ کم تھا مگر وہ مدہوش تھی۔ چڈہ کانشہ سر کو چڑھا تو وہ ہو فی لس کو اپنے ساتھ لے جانے پر بضد ہوا جس پر ممی سے اس کی لڑائی ہو گئی۔ چڈہ کی مستقل زور آزمائی پر ممی نے اسے چانٹا دے مارا۔ اس واقعے کے بعد چڈہ ممی کا گھر فوری چھوڑ کر منٹو کے ہمراہ سعیدہ کاٹیج آیا اور سو گیا۔ صبح اٹھا تو کسی سے محو گفتگو تھا اور ممی کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ منٹو نے اس بابت اپنی بیوی سے بھی بات کی تو اس نے یہی رائے دی کہ ممکن ہے فی لس ممی کی کوئی قریبی تعلق دار ہے یا یہ کہ وہ اسے چڈہ کے ساتھ بھیجنے کی بجائے کسی اور کے ساتھ بھیجنا چاہتی ہے۔ بہر حال اصل وجہ تک دونوں نہ پہنچ سکے جبکہ اصل وجہ یہ تھی کہ ممی کے گھر سب بے تکلفانہ آتے جاتے ضرور تھے، پیتے پلاتے، ناچ گانا موج مستی کرتے، کھانا کھاتے یہاں تک کہ سو جاتے لیکن ممی جنس کا دھندہ نہ کرتی تھی۔ اس نے سب کو مل بیٹھنے کے لیے ایک آستانہ ضرور فراہم کر رکھا تھا، اندھی بھوک مٹانے کا کچھ اہتمام البتہ وہ نہ کرتی تھی۔ تاہم تھپڑ کھانے کے بعد بہت عرصے تک چڈہ ممی کی طرف نہ گیا۔ شاید اسے اپنے اس رات کے رویے پر شرمندگی تھی اور وہ ممی کا سامنا نہ کر سکتا تھا۔ منٹو کا پونا جانا ہوا تو وہ چڈہ کی طرف گیا، اس کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے طبیعت بہت بگڑی تو ممی کو بلایا گیا، وہ دوڑی چلی آئی گویا حقیقی ماں ہے۔ ممی نے فوراً ڈاکٹر کو بلایا اور آخر کار چڈہ کو ہسپتال لے گئی۔ چڈہ کی بیماری کا مذکور صرف منٹو سے کیا گیا، مذکور مع ترجمہ ملاحظہ ہو:

"ممی نے اکیلے میں مجھے بتایا کہ مرض بہت خطرناک ہے۔ یعنی پلیگ۔ یہ سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔" (۴۴)

"Mummy called me aside and told me that he had plague. Hearing this I lost my nerve"(۴۵)

"Mummy drew me aside and said that he was very sick with the plague. When I heard this, I nearly fainted"(۴۶)

متن کے دونوں ترجمے تھوڑے بہت حذوف کے ساتھ لفظی ہیں۔ مثلاً مرض کی خطرناکی کا دونوں ترجموں میں ذکر نہیں کیا گیا۔ "ممی" کے لیے حسب سابق گلوبل ٹیکسٹ مستعار لیا گیا ہے۔ "پلیگ" کیلق کی مثال ہے اس لیے اس کا ماخذ لفظ بمطابق قاعدہ اختیار کیا گیا ہے۔ "اوسان خطا ہونا" کی ترجمانی پہلے ترجمہ میں عمدہ جبکہ دوسرے میں قابلِ قبول ہے۔ مجموعی طور پر متن کے اس حصے کے دونوں ترجمے اچھے ہیں۔

چڈہ کی بیماری کو لے کر خود ممی بہت پریشان تھی۔ لیکن اس کو امید تھی کہ یہ بلا ٹل جائے گی اور چڈہ بہت جلد تندرست ہو جائے گا۔ ممی کی امید بر لائی اور ممی کی مکمل دیکھ بھال کی بدولت چڈہ تندرست ہو گیا۔ سعیدہ کاٹیج کے کئی مکین جگہ بدل گئے مگر ممی کے گھر کی رونقیں اسی طرح قائم رہیں۔ ان محافل میں چڈہ کو اکثر اپنے اس رات کے رویے پر ممی کے سامنے شرمندگی محسوس ہوتی تھی تاہم ممی نے اسے کبھی کچھ باور نہ کرایا۔ چڈہ اکثر خود کو کوستا مگر ممی مسکرا دیتی۔ ممی کے گھر میں جمنے والی محفلیں رنگین ضرور ہوتی تھیں لیکن ان میں جنسی بدفعلیوں کی بو بہر حال شامل نہ تھی۔ کچھ بھی ڈھکا چھپا نہ ہوتا، سب کچھ واضح، صریح ہوتا۔ اسی اثنا میں ایک عجیب بات ہوئی۔ پولیس نے ممی کے گھر کو جنسی اڈہ بنانے کی کوشش کی، ممی کے انکار پر الٹا پولیس اس کے خلاف ہو گئی اور اسے شہر بدر ہونے کا فیصلہ

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

سنادیا۔۔ ممی کے پونا چھوڑ کے جانے پر اس کے پروردہ اداس اور رنجیدہ تھے۔ انہوں نے ایک الوداعی پارٹی کا اہتمام کیا جس میں ایک طرف ممی کو خوب پیار کیا تو دوسری طرف پولیس اور معاشرے کے دیگر گھناؤنے کرداروں کے خلاف خوب دل کی بھڑاس نکالی۔ اس واقعے کا سب سے زیادہ اثر چڈہ نے لیا۔ بظاہر اس نے ممی کے پونا سے چلے جانے کو بہتر سمجھا کہ اس طرح کم از کم وہ بدقماش افسران کے چنگل سے تو آزاد ہو گئی لیکن ممی کے ساتھ اس کی رفاقت کا طویل سلسلہ فرقت میں بدلا تو اس کی کیفیت غیر ہو گئی۔ افسانے کا اخری جملہ از قلم منٹو مع ترجمہ ملاحظہ ہو:

"میں نے دیکھا، چڈے کی انکھوں میں آنسو اس طرح تیر رہے تھے جس طرح مقتولوں کی لاشیں۔" (۴۷)

"I looked at Chaddha. Tears were floating in his eyes like many corpses of recently crucified"(۴۸)

"I noticed tears in Chaddah's eyes. They floated there like corpses on water" (۴۹)

متن کے دونوں ترجمے لفظی ترجمہ کی تکنیک کے تحت کیے گئے ہیں جبکہ "چڈہ" کے لیے حسب سابق گلوز مستعمل ہے، معمولی استزاد دونوں ترجموں میں موجود ہے جبکہ کوئی حذف سامنے نہیں آتا۔ پہلے ترجمہ میں recently اور دوسرے ترجمہ میں water کا مذکور زائد از متن ہے تاہم ان زوائد سے متن کی معنویت میں کچھ خاص ردوبدل واقع نہیں ہوتا۔ مجموعی طور پر متن کے اس حصے کا ترجمہ اچھا ہے۔

افسانے کے دونوں تراجم کو سامنے رکھا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ گلوز، مستعار لفظی اور گلوبل ٹیکسٹ مستعار لینے کے اعتبار سے دونوں ترجمے کافی حد تک برابر ہیں۔ پہلے ترجمے میں حذوف کی شرح دوسرے ترجمے کی نسبت خاصی بلند ہے جس کی وجہ سے متن کے مفاہیم کی ترسیل کلی طور پر نہیں ہو پائی۔ دوسرا ترجمہ پہلے ترجمہ کی نسبت اچھا ہے، اگرچہ یہاں بھی چند اختلافات واقع ہیں تاہم ان کی نوعیت خفیف ہے۔ پہلے ترجمہ کی نسبت دوسرے ترجمہ میں مفاہیم کا ابلاغ بہتر ہے۔ دونوں ترجموں کے مجموعی مطالعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ثقافتی متون کی ترجمانی کے لیے معیاری پیمانے وضع کرنے کی ضرورت ہے۔ بامحاورہ متن کا ترجمہ اس وقت تک قدرے آسان ہوتا ہے جب تک اس میں مخصوص ثقافتی عناصر دخیل نہیں ہوتے تاہم جیسے ہی مخصوص ثقافتی متون کی ترجمانی کا عمل سرانجام دیا جاتا ہے، بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ ان کے مساوی الفاظ وتراکیب ہدف زبان میں بھی موجود ہوں۔ ایسے میں غیر لچکدار مخصوص ثقافتی عناصر کے لیے گلوز یا مستعار لفظی جبکہ لچکدار مخصوص ثقافتی عناصر کے لیے نیوٹرلائزیشن کی تکنیک اختیار کی جاسکتی ہے۔ مطالعہ سے ایک نکتہ یہ بھی سامنے آتا ہے کہ اکثر مترجمین وہاں بھی نیوٹرلائزیشن کی تکنیک اختیار کرتے ہیں جہاں لفظی یا بامحاورہ تکنیک کو آسانی سے اختیار کیا جا سکتا ہے۔ ایسے میں مترجمین کو چاہیے کہ پہلا انتخاب لفظی یا بامحاورہ تکنیک ہی رکھیں تاکہ متن کی اصل روح کو ترجمہ میں بھی محسوس کیا جا سکے۔ بصورت دیگر ترجمہ متنی موضوع کا روکھا پھیکا بیانیہ بن جاتا ہے۔

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

تحقیقی و تنقیدی مجلہ
دریافت

حواشی و حوالہ جات

۱۔ شکیل الرحمٰن، منٹو شناسی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۲۰۰۰ء، بار دوم۔ ص۶۹-۷۰

۲۔ فرزانہ اسلم، ڈاکٹر، سعادت حسن منٹو، حیات اور افسانے، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۹ء، ص۹۸

۳۔ وین فین ینگ، بریف اسٹڈی آن ڈومیسٹی کیشن اینڈ فارنائزیشن اِن ٹرانسلیشن، جرنل آف لینگویج ٹیچنگ اینڈ ریسرچ، والیوم ا، نمبر ا، اکیڈمی پبلشرز، فن لینڈ۔ جنوری ۲۰۱۰ء، ص۷۷

۴۔ ہینو کیمپنن، مار جاجینیز، الیگزینڈرا بیلکوا، ڈومیسٹی کیشن اینڈ فارنائزیشن اِن ٹرانسلیشن اسٹڈیز، فرینک اینڈ ٹم، فن لینڈ، ۲۰۱۲ء، ص۷

۵۔ لارنس وینوتی، دی ٹرانسلیٹرز اِنوِزِبلٹی: اے ہسٹری آف ٹرانسلیشن، روٹلیج، لندن اینڈ نیویارک، ۱۹۹۵ء، ص۵۴

۶۔ فیڈونگ، این اپروچ ٹو ڈومیسٹی کیشن اینڈ فارنائزیشن فرام دا اینگل آف کلچرل فیکٹرز ٹرانسلیشن، مشمولہ: تھیوری اینڈ پریکٹس ان لینگویج اسٹڈیز، والیوم ۴، نمبر ۱۱، اکیڈمی پبلشرز، نومبر ۲۰۱۴ء، ص۲۴

۷۔ شمیم حنفی، منٹو: حقیقت سے افسانے تک، دلی کتاب گھر، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص۳۰

۸۔ سعادت حسین منٹو، ممی، مشمولہ: منٹو نامہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص۱۷۹

۹۔ مدن گپتا (مترجم)، سعادت حسن منٹو (سیلیکٹڈ اسٹوریز)، کوسمو پبلی کیشنز، انڈیا، ۱۹۹۷ء، ص۳۳۷

۱۰۔ میٹ ریک و آفتاب احمد (مترجمین)، سعادت حسن منٹو ممبئی اسٹوریز، وینتاج بکس، نیویارک، ۲۰۱ء، ص۱۱۷

۱۱۔ منٹو، ممی، ص۱۸۰-۱۸۱

۱۲۔ مدن گپتا، سعادت حسن منٹو (سلیکٹڈ اسٹوریز)، ص۳۳۸

۱۳۔ میٹ ریک و آفتاب احمد، سعادت حسن منٹو ممبئی اسٹوریز، ص۱۱۸

۱۴۔ منٹو، ممی، ص۱۸۲

۱۵۔ مدن گپتا، سعادت حسن منٹو (سلیکٹڈ اسٹوریز)، ص۳۳۹

۱۶۔ میٹ ریک و آفتاب احمد، سعادت حسن منٹو ممبئی اسٹوریز، ص۱۱۹

۱۷۔ منٹو، ممی، ص۱۸۳

۱۸۔ مدن گپتا، سعادت حسن منٹو (سلیکٹڈ اسٹوریز)، ص۳۴

۱۹۔ میٹ ریک و آفتاب احمد، سعادت حسن منٹو ممبئی اسٹوریز، ص۱۲۰

۲۰۔ منٹو، ممی، ص۱۸۶

۲۱۔ مدن گپتا، سعادت حسن منٹو (سلیکٹڈ اسٹوریز)، ص۳۴۲

۲۲۔ میٹ ریک و آفتاب احمد، سعادت حسن منٹو ممبئی اسٹوریز، ص۱۲۲

۲۳۔ منٹو، ممی، ص۱۸۷-۱۸۸

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

۲۴۔ مدن گپتا، سعادت حسن منٹو (سلیکٹڈ اسٹوریز)، ص ۳۴۴
۲۵۔ میٹ ریک و آفتاب احمد، سعادت حسن منٹو ممبئی اسٹوریز، ص ۱۲۴
۲۶۔ منٹو، ممی، ص۱۸۹
۲۷۔ مدن گپتا، سعادت حسن منٹو (سلیکٹڈ اسٹوریز)، ص ۳۴۵
۲۸۔ میٹ ریک و آفتاب احمد، سعادت حسن منٹو ممبئی اسٹوریز، ص ۱۲۵
۲۹۔ منٹو، ممی، ص ۱۹۰-۱۹۱
۳۰۔ مدن گپتا، سعادت حسن منٹو (سلیکٹڈ اسٹوریز)، ص ۳۴۶
۳۱۔ میٹ ریک و آفتاب احمد، سعادت حسن منٹو ممبئی اسٹوریز، ص ۱۲۷
۳۲۔ منٹو، ممی، ص ۱۹۳
۳۳۔ مدن گپتا، سعادت حسن منٹو (سلیکٹڈ اسٹوریز)، ص ۳۴۸
۳۴۔ میٹ ریک و آفتاب احمد، سعادت حسن منٹو ممبئی اسٹوریز، ص ۱۲۸
۳۵۔ منٹو، ممی، ص ۱۹۳
۳۶۔ مدن گپتا، سعادت حسن منٹو (سلیکٹڈ اسٹوریز)، ص ۳۴۸
۳۷۔ میٹ ریک و آفتاب احمد، سعادت حسن منٹو ممبئی اسٹوریز، ص ۱۲۸
۳۸۔ منٹو، ممی، ص ۱۹۴
۳۹۔ مدن گپتا، سعادت حسن منٹو (سلیکٹڈ اسٹوریز)، ص ۳۴۸
۴۰۔ میٹ ریک و آفتاب احمد، سعادت حسن منٹو ممبئی اسٹوریز، ص ۱۲۹
۴۱۔ منٹو، ممی، ص ۲۰۲
۴۲۔ مدن گپتا، سعادت حسن منٹو (سلیکٹڈ اسٹوریز)، ص ۳۵۳
۴۳۔ میٹ ریک و آفتاب احمد، سعادت حسن منٹو ممبئی اسٹوریز، ص ۳۵۳
۴۴۔ منٹو، ممی، ص ۲۰۷
۴۵۔ مدن گپتا، سعادت حسن منٹو (سلیکٹڈ اسٹوریز)، ص ۳۵۷
۴۶۔ میٹ ریک و آفتاب احمد، سعادت حسن منٹو ممبئی اسٹوریز، ص ۱۳۹
۴۷۔ منٹو، ممی، ص ۲۲۰
۴۸۔ مدن گپتا، سعادت حسن منٹو (سلیکٹڈ اسٹوریز)، ص ۳۶۵
۴۹۔ میٹ ریک و آفتاب احمد، سعادت حسن منٹو ممبئی اسٹوریز، ص ۱۴۹

References in Roman Script:

1. Shakil ur Rehman, Manto Shanasī, Maktabah Jāmi'ah Limited, New Dehli, 2000, 2nd Edition, P. 69-70
2. Farzana Aslam, Dr., Sādat Hasan Manto: Hayāt aur Afsānay, Educational Publishing House, Dehli, 2009, P. 98
3. Wenfen Yang, "Brief Study on Domestication and Foreignization in Translation," Journal of Language Teaching and Research, Vol. 1, No. 1, Academy Publisher, Finland, January 2010, P. 77
4. Hannu Kemppanen, Marja Janis, Alexandra Belikova, "Domestication and Foreignization in Translation Studies," Franke & Timme, Finland, 2012, P. 7
5. Lawrence Venuti, The Translator's Invisibility: A History of Translation, Routledge, London & New York, 1995, P. 54
6. Fade Wang, "An Approach to Domestication and Foreignization from the Angle of Cultural Factors in Translation," Published in: Theory and Practice in Language Studies, Vol. 4, No. 11, Academy Publisher, November 2014, P. 2424
7. Shamim Hanfi, Manto: Haqiqat Se Afsānay Tak, Dehli Kitab Ghar, Dehli, 2012, P. 30
8. Sādat Hasan Manto, Mummy, included: Manto Nāmah, Sang-e-Mīl Publications, Lahore, 2014, P. 179
9. Madan Gupta (Translator), Sādat Hasan Manto (Selected Stories), Cosmo Publications, India, 1997, P. 337
10. Matt Reeck and Aftab Ahmad (Translators), Sādat Hasan Manto Bombay Stories, Vintage Books, New York, 2014, p. 117
11. Manto, Mummy, P. 180-181
12. Madan Gupta, Sādat Hasan Manto (Selected Stories), p. 338
13. Matt Reeck and Aftab Ahmad, Sādat Hasan Manto Bombay Stories, P. 118
14. Manto, Mummy, p.182
15. Madan Gupta, Sādat Hasan Manto (Selected Stories), P. 339
16. 16. Matt Reeck and Aftab Ahmad, Sādat Hasan Manto Bombay Stories, P. 119
17. Manto, Mummy, P. 183
18. Madan Gupta, Sādat Hasan Manto (Selected Stories), P. 340
19. Matt Reeck and Aftab Ahmad, Sādat Hasan Manto Bombay Stories, P. 120
20. Manto, Mummy, P. 186
21. Madan Gupta, Sādat Hasan Manto (Selected Stories), P. 342
22. Matt Reeck and Aftab Ahmad, Sādat Hasan Manto Bombay Stories, p. 122
23. Manto, Mummy, P. 187-188
24. Madan Gupta, Sādat Hasan Manto (Selected Stories), P. 344
25. Matt Reeck and Aftab Ahmad, Sādat Hasan Manto Bombay Stories, p. 124
26. Manto, Mummy, P. 189
27. Madan Gupta, Sādat Hasan Manto (Selected Stories), P. 345
28. Matt Reeck and Aftab Ahmad, Sādat Hasan Manto Bombay Stories, p. 125
29. Manto, Mummy, P. 190-191
30. Madan Gupta, Sādat Hasan Manto (Selected Stories), P. 346

31. Matt Reeck and Aftab Ahmad, Sādat Hasan Manto Bombay Stories, p. 127
32. Manto, Mummy, P. 193
33. Madan Gupta, Sādat Hasan Manto (Selected Stories), P. 348
34. Matt Reeck and Aftab Ahmad, Sādat Hasan Manto Bombay Stories, P. 128
35. Manto, Mummy, P. 193
36. Madan Gupta, Sādat Hasan Manto (Selected Stories), P. 348
37. Matt Reeck and Aftab Ahmad, Sādat Hasan Manto Bombay Stories, P. 128
38. Manto, Mummy, P. 194
39. Madan Gupta, Sādat Hasan Manto (Selected Stories), P. 348
40. Matt Reeck and Aftab Ahmad, Sādat Hasan Manto Bombay Stories, P. 129
41. Manto, Mummy, P. 202
42. Madan Gupta, Sādat Hasan Manto (Selected Stories), P. 353
43. Matt Reeck and Aftab Ahmad, Sādat Hasan Manto Bombay Stories, P. 135
44. Manto, Mummy, P. 207
45. Madan Gupta, Sādat Hasan Manto (Selected Stories), P. 357
46. Matt Reeck and Aftab Ahmad, Sādat Hasan Manto Bombay Stories, P. 139
47. Manto, Mummy, P. 220
48. Madan Gupta, Sādat Hasan Manto (Selected Stories), P. 365
49. Matt Reeck and Aftab Ahmad, Sādat Hasan Manto Bombay Stories, P. 149

Mrs. Itrat Batool is a Ph.D. scholar in the Department of Urdu Zuban-O-Adab at Fatima Jinnah Women University, Rawalpindi, Pakistan She completed her M.Phil. from Allama Iqbal Open University, Pakistan, specializing in Urdu Research, Editing, and Translations. She has published 14 articles. Her research interests include adaptations of world literature in Urdu.

Dr. Aqlima Naz is an Assistant Professor in the Department of Urdu Zuban-O-Adab at Fatima Jinnah Women University, Rawalpindi, Pakistan. She completed her Ph.D. in Urdu from the National University of Modern Languages, Islamabad, Pakistan, specializing in Prose and Editing. She has authored 25 articles. Her research focuses on the preservation and study of prose traditions in Urdu literature.

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلہ
دریافت

Received: 8th Aug, 2024 | Accepted: 15th Dec, 2024 | Available Online: 31st Dec, 2024
Digital Object Identifier: 10.52015/daryaft.v16i02.394

جدید اُردو فکشن: خواندگی کی سیاست اور سوال کی موت

Modern Urdu Fiction: Politics of Literacy and the Asphyxiation of Critical Thinking

Dr. MUHAMMAD SOHAIL IQBAL[1] And Dr. MUHAMMAD RASHID IQBAL[2]
[1] Ph.D. Urdu Alumni, International Islamic University, Islamabad, Pakistan
[2] Assistant Professor, Government Islamia Graduate College, Kasur, Pakistan
Corresponding Author: Dr. Muhammad Sohail Iqbal (m.sohail1005@gmail.com)

ABSTRACT This study is a critical and textual analysis of Dr. Humera Ishfaq's short story, Ibne Suqrat and Shahid Siddiqui's novel Aadhay Adhoray Khab. The mentioned works have focused the vandalised education and deliberate aloofness of the political authorities in the third world countries. The teachers are the elevated platforms to offer the nations the stages where questions for awareness, vision and better life may be raised. It was for such enlightening questions that Aristotle, Socrates, Galileo, Giordano Bruno and Pythagoras had been made answerable by those powers who felt threatened because of education and enlightenment. It is because of Education and teachers that the individuals mature, societies improve and ultimately the nations progress. The anti-enlightenment forces, however, still try to resist education and the educationists because education removes that rust from the minds which frees the masses from blind traditionalism and confirmation. The current critical analysis, on one hand, elaborates the selected works and on the other hand; explores the prevailing causes of the collapse of education in the developing countries.

This article assesses the divisions and the relevant impressions of standard versus non-standard education systems. Education has the potential to enable and renovate societies, but its efficacy is liable to administrative policies. The responsibility lies with policy-makers to either elevate people through education or quash critical views by retaining imperfect education standards. This study also analyses how education policies shape societies, comparing approaches that prolong obsolete stereotypes.

Keywords: Dr Humera Ishfaq, Shahid Siddiqui, Teacher, Student, Education, Conscious, Question, Society, Transformation, Socrates, Nation, Enlightenment.

تعلیم انسانی ترقی کی منازل کا وہ زینہ ہے جس نے انسان کو سوال کرنے کا ایسا شعور عطا کیا ہے کہ جو آج کے دور میں ایک مہذب معاشرے کے لئے ضروری ہے اور انقلاب پیدا کرنے میں تعلیم اور سوال کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ انسان نے ہر دور میں پڑھنے لکھنے کے طریقے ایجاد کیے، پتھر پر کندہ کی گئی تحریر سے لے کر آج پریس کے زمانے تک کا سفر تعلیم کا ہی مرہون منت ہے جس کے اثرات انسانی زندگیوں پر واضح طور پر ثبت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم کو پیدا کیا تو اسے بے شمار زبانوں کا بھی ایک

This work is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

نظام عطا کیا، سلسلہ شروع ہوا جو وقتاً فوقتاً اپنی قوموں کو تبلیغ اور اصلاح کرتے، جن پر اللہ کی طرف سے صحیفے، احکامات اور آسمانی کتب بھی نازل ہوئیں جو انسانوں کے لیے علم و ادب اور شعور کا سرچشمہ تھیں۔ قرآن کی ابتدا بھی لفظ "اقرا" سے ہوئی اور اسی روش نے مستقبل میں استاد اور شاگرد کا روحانی رشتہ استوار کیا۔ ۱۸۵۷ میں برصغیر کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت بہت ہی تشویش ناک تھی جس کا حل صرف جدید مغربی معیاری تعلیم میں تھا۔ سرسید احمد خان نے نہ صرف تعلیمی معیار کو اہمیت دی بلکہ اس کے لیے ادارہ سازی بھی کی جس کے انتہائی مثبت اثرات سے کوئی بھی صاحبِ بصیرت انسان انکار نہیں کر سکتا۔ سرسید احمد خان کی معیاری تعلیم کی پالیسیوں کے بارے میں پروفیسر جیکولین آسٹن نے ادارہ برائے سماجی انصاف (CSJ) اور میر خلیل الرحمن سوسائٹی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی ایک تعلیمی کانفرنس میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

> "سرسید نے تعصب کا مقابلہ کرنے اور پسماندہ اقوام کو ترقی دلوانے کے لیے معیاری تعلیم کو ذریعہ بنایا۔ سرسید علم کی طاقت کو معاشرتی تبدیلی اور تعمیر نو کا ایک موثر ذریعہ سمجھتے تھے ۔انہوں نے ایسے اداروں کی بنیاد رکھی جو آنے والی نسلوں کے لیے روشنی کا مینار بن گئے ۔انہیں پختہ یقین تھا کہ جدید سائنسی تعلیم کے حصول کے بغیر معاشرے میں ترقی نہیں ہو گی۔" (۱)

انسانوں کی اصلاح اور ان کے اندر شعور اور سوال پیدا کرنے کے لئے کسی راہ نما کی ضرورت پڑی تو اُس خلا کو استاد نے ہی پُر کیا۔ ایسا سوال جس کا تعلق شعور اور ادراک سے ہو۔ڈاکٹر حمیرا اشفاق نے افسانہ "ابنِ سقراط" اور شاہد صدیقی نے اپنے ناول "آدھے آدھورے خواب" میں سوال اور تعلیم کی اہمیت کو ہی موضوعِ بحث بنایا ہے۔ اس لیے تعلیم اور سوال انسانی زندگی میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں جو بادشاہی نظام حکومت، آمریت، جاگیرداروں، وڈیروں، نوابوں اور نام نہاد حکمرانوں، غاصب قوتوں اور استعماری آقاؤں کے اقتدار کے لیے سنگین خطرہ ہیں۔ سٹیفن پی کوہن (Stephen P. Cohen) نے بھی ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

> " پاکستانی حکومت اور اشرافیہ، تعلیم کو اپنے لیے اور ریاست پر اپنے کنٹرول کے لیے خطرہ سمجھتی ہے۔انہوں نے اس جانب بھی توجہ دلائی کہ پاکستان کی ایک نسل ضائع ہو چکی ہے، جیسے ۲۰۰۲ء میں اصلاحاتی کاوشوں سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا۔ ان کے الفاظ میں ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ وہ جنہیں رعایتیں نہ مل سکی تھیں، ہمیں سزا دینے کے مختلف طریقے تلاش کر رہے ہیں۔" (۲)

شخص جتنا تعلیم یافتہ ہو گا اُس کا کسی معاملہ، مسائل کے بارے میں بھی سوال اتنا ہی اچھا اور تہہ دار ہو گا جس سے عوام مخفی حقائق سے آشنا ہوتے ہیں اور نام نہاد ہتھکنڈے واہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس لیے سوال کرنا سنجیدہ شعور کی علامت ہے جو کسی مسئلے کے پس منظر کو سمجھنے میں آسانی پیدا کرتے ہیں۔ اگر کوئی صحافی امریکی صدر "بش" سے یہ سوال کرے کہ دنیا آپ اور آپ کے والد سے نفرت کیوں کرتی ہے؟ تو تعلیم یافتہ عوام سمجھ جائے گی کہ سوال کا سیاسی تاریخی سیاق وسباق کیا ہے۔ اس کی بہ جائے یہ سوال کیا جائے کہ

سر آپ پاکستان آئے، آپ کو پاکستان کیسا لگا؟ تو اس سوال میں کمزور ذہن،خوشامدی اور چاپلوس شخص عیاں ہوتا ہے۔ارسطو، سقراط، گلیلیو جیورڈانو برونو اور فیثا غورث اپنے علم اور سوالات کی وجہ سے زیر عتاب ٹھہرائے گئے کہ اگر ان کے علم اور سوالات کا رستہ نہ روکا گیا تو چرچ اور پادریوں کا اقتدار اپنی اہمیت کھو سکتا ہے اس لئے ان کو عبرت کی مثال بنانا ضروری ٹھہرا۔ایسا ہی مقدمہ ڈاکٹر حمیرا اشفاق کے افسانہ "ابن سقراط" میں زیر غور ہے جس میں فیصلہ جیوری نے کرنا ہے۔ آدھے لوگ سزائے موت دینے کے حق میں ہیں اور باقی عمر قید۔لیکن پادری مذہب پر اپنی ڈوری کسی بھی طرح کمزور کرنے کے لئے تیار نہیں:

"اے بادشاہِ وقت! اس پر علم کی دیویاں قابض ہو چکی ہیں، اس نے علم کی اُن حدود کو چھونے کی کوشش کی ہے جہاں پر ادراک کے دروازے کھل جاتے ہیں۔" (۳)

شاہد صدیقی ایک ماہر تعلیم ہونے کے ساتھ ساتھ زبان پر بھی مہارت تامہ رکھتے ہیں۔انہوں نے ہمیشہ سے ہی تعلیم کو اپنا موضوع بنایا ہے اور اپنے تعلیمی خیالات و نظریات کو بیان کرنے کے لیے ادبی صنف "ناول" کا سہارا لیا ہے۔شاہد صدیقی نے بھی اس ناول میں علم کو انقلاب، سوال اور ادراک کا رستہ بتایا ہے جو غاصب قوتوں اور سامراجیت کے لیے ناقابل برداشت ہے جو سماج میں تبدیلی لانے کا موجب ہے۔ تعلیم اور سوال علم کی پہلی الجھن ہے وہ اپنے لیکچر کے دوران شاگردوں کو الجھن میں دیکھ کر یہی کہتے:

"علم کا پہلا زینہ اُلجھن ہوتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ میں سے بہت سے لوگ اُلجھ رہے ہوں گے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔لیکن زیادہ اُلجھنا بھی ٹھیک نہیں خواہش اپنا راستہ خود تراشتی ہے، منزل اپنی راہ کو خود جنم دیتی ہے اور تعبیر اپنا خواب خود چنتی ہے۔" (۴)

معیاری تعلیم کے ذریعے عوام اور سماج میں مثبت تبدیلیاں لائی جاسکتی ہیں۔دنیا کے ترقی یافتہ ممالک اس کی روشن مثال ہیں۔یورپ اور مغرب تعلیم کے ذریعے ہی کائنات کو مسخر کرنے میں مصروف عمل ہیں۔تعلیم، نظریات، خیالات اور سوالات ہی کی بدولت یونان نے پوری دنیا میں اپنا نام پیدا کیا کیونکہ وہاں سوال کی موت کے امکان ختم ہو گئے ہیں۔ارسطو، سقراط اور بقراط کے علم، نظریات اور سوالوں نے یونان کا نام آج تک زندہ رکھا ہوا ہے اور پوری دنیا نے اپنی استعداد کے مطابق ان مشاہیر ادب سے اپنے سماج میں انقلاب برپا کیا۔اس لئے استاد، علم اور سوال کرنا ایسی خوبیاں ہیں جو انسانوں کی زندگیوں کو تبدیل کرنے اور باشعور بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔لیکن تیسری دنیا کے بیشتر ممالک اچھے استاد اور معیاری تعلیم کی نعمت سے کوسوں دور ہیں۔ان ممالک میں حکومتوں نے انتہائی غیر مناسب تعلیمی معیار، تحقیق سے عاری نصاب، حقائق کو مسخ کرنے والا مواد، غیر ضروری موضوعات، کم فہم اساتذہ کی بھرتی، علاقائی زبانوں میں تعلیم، عملی تحقیق سے دور، دقیانوسی خیالات کی بھرمار، مغربی علم کے بارے میں پروپیگنڈا اور انگریزی نظام تعلم کا مذاق کو اپنی پالیسی بنا رکھا ہے، تاکہ عوام کے ذہن میں شعوری تبدیلی کی سوچ کا راستہ روکا جاسکے اور سوال کی پیدائش کے امکان ہی نہ ہوں کیونکہ معیاری تعلیم شعور اور سوال کرنے کی ضامن ہے جو تیسری دنیا کے حکمرانوں کے اقتدار کے لیے خطرہ ہے۔کیونکہ علم سے انسان پر علم کی دیویاں قابض ہو جاتی ہیں۔علم ہی ادراک کا راستہ ہے اور ان ممالک میں ان دروازوں کو کھولنے کی اجازت نہیں دی سکتی۔یہ سوال بھی نہیں پوچھا جاسکتا کہ یہ دروازہ کیوں بند ہے؟ لیکن اگر سوال پیدا ہو جائے تو اس کو ابدی زندگی بھی مل جاتی ہے۔سوال

کرنے والے کو قتل بھی کر دیا جائے تو سوال پھر بھی زندہ رہتا ہے۔ سقراط کو زہر کا پیالہ پلانے والے کا نام کوئی بھی نہیں جانتا لیکن سقراط کو آج بھی ساری دنیا میں عزت و احترام حاصل ہے۔ ڈاکٹر حمیرا اشفاق کا افسانہ اسی بات کی تائید کرتا ہے:

"اے شہنشاہ! سقراط نے بہت سے دلوں کو روشن کیا، ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ یونان کو اسی کی بدولت بہت شان و شوکت نصیب ہوئی، گستاخی معاف، ہمیں اور ہماری اس کابینہ کو تاریخ کے اوراق مسخ کر دیں گے مگر اس کی شخصیت اور خیالات ابد تک زندہ رہیں گے۔" (۵)

شاہد صدیقی کے ناول کا مرکزی کردار ایک پروفیسر سہارن رائے ہے جو طالب علموں کے لئے ایک مثالی استاد ہیں۔ کبھی کلاس میں کرسی پر نہیں بیٹھے۔ وہ ہر وقت مستعد رہتے ہیں اور چشم زدن میں ایک کونے سے دوسرے کونے اور ایک گروپ سے دوسرے گروپ تک پہنچ جاتے ہیں۔ ان کی کلاس میں سونے اور اکتاہٹ کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اپنی باشعور صلاحیت اور تعلیمی مہارت سے طالب علموں کے ذہنوں کی سوئی ہوئی صلاحیتوں کو بیدار کرنے کے ہنر میں مہارت رکھتے ہیں۔ ان کے درس و تدریس کا طریقہ بھی پُر تاثیر اور تجسس سے لبریز ہوتا ہے جو طالب علموں کی صلاحیتوں کو نکھارنے میں موثر ثابت ہوتا ہے۔ کلاس کا آغاز بھی ایک سوال سے ہوتا ہے کہ اچھے استاد کی تعریف کیا ہے؟ ہر ایک کو سوچنے کے لئے دو منٹ وقف کرتا ہے۔ اس کے بعد طالب علموں سے مخاطب ہوتا:

"اب سر رائے صاحب چاک لے کر بورڈ کے پاس کھڑے ہو گئے اور ہمارے دیئے گئے پوائنٹس بورڈ پر لکھنے لگے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے استاد کے لئے مشکل مگر ضروری کام ہولڈ بیک (Hold Back) کرنا ہوتا ہے تاکہ طالب علموں کو سوچنے کا موقع مل سکے۔ لیکن اکثر استاد بے صبری میں اپنا علم کلاس میں انڈیل دیتے ہیں اور طالب علموں کے دماغ بند تجوریوں کی طرح اَن کھلے رہ جاتے ہیں۔ علم کے کیسے کیسے ہیرے موتی بغیر استعمال کے زنگ آلود ہو جاتے ہیں۔" (۶)

اصل معنوں میں انقلابی تبدیلی سماج میں تب ہی ممکن ہے جب مدرسوں، سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اساتذہ کرام بھی اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل ہوں جو طالب علموں کی زندگیوں کو انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے جوڑ سکیں۔ قابل اساتذہ کے بغیر تعلیمی اداروں کی حیثیت ٹک ٹوک اور فیک ویڈیوز کی سی ہے۔ انسانی زندگی میں بہتری صرف علم یا تعلیم کے نام پر دقیانوسی خیالات سے نہیں آ سکتی بلکہ اس سے سماج میں نفرت، فرقہ پرستی، لاقانونیت، علم کی تذلیل، طبقاتی کشمکش، حسد، دھوکہ دہی، لوٹ مار، جیسی برائیاں پیدا ہوتی ہیں جن سے حکمران طبقہ خوب فائدہ اٹھاتے ہیں اور یوں ان کے خاندانوں کی نسل در نسل حکمرانی قائم و دائم رہتی ہے۔ لیکن ایک اہل علم اور باصلاحیت استاد طالب علموں میں غور و فکر کی ایسی عادت تخلیق کرتا ہے جو نام نہاد حکمرانوں اور سامراجیت کے جھوٹے اور مخفی حقائق کو بآسانی سمجھ جاتے ہیں۔ جس کی اجازت نہیں دی جا سکتی کیونکہ یہ اصل ادراک تک پہنچنے کا رستہ ہے جو سوال کرنے کی صلاحیت سے ہمکنار ہے:

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

"ماہرین تعلیم نے بڑے واضح اور پُرزور طریقے پر اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ جمہوری نظام کی بقا اور ایک صحت مند سماج کے قیام کی پہلی اور آخری شرط تعلیم کی ترویج و تبلیغ ہی ہے۔ کسی ملک کے سیاسی نظام میں رائے عامہ کی جتنی زیادہ اہمیت ہو گی رائے عامہ کو مثبت ڈھنگ سے سنوارنے اور اسے صحت مند رکھنے کی اتنی ہی ذمہ داری تعلیم یا دوسرے الفاظ میں تعلیمی اداروں کی ہو گی۔ اگر حیات انسانی کو بہتر کرنا ہے تو اس عظیم کام میں معتبر امداد تعلیم اور صرف تعلیم ہی سے مل سکتی ہے۔" (۷)

ڈاکٹر حمیرا اشفاق کا افسانہ " ابنِ سقراط " ایسا فن پارا ہے جس میں تعلیم، استاد اور سوال کی ایک طویل روایت کو بیان کیا ہے جس کا آغاز سقراط سے ہوتا ہے لیکن یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ موجودہ دور میں ابن سقراط کوئی بھی شخص، استاد اور دانشور ہو سکتا ہے جو حکومتوں کے اوچھے ہتھکنڈوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرے۔ عوام میں سوال کرنے کی عادت پیدا کرے، سیاست پر عمدہ کتاب لکھ کر عوام میں سیاسی شعور پیدا کرے، ذرائع آمدن پر قابض قوتوں کی نشاندہی کرے، حاکم وقت سے ٹکرانے کی کوشش کرے جو ان کے اقتدار کے لئے خطرہ بنے تو ایسے ابن سقراط، اساتذہ کرام اور دانشوروں کو عبرت کی مثال بنانے کے لیے حکومت کے پاس بہت سے ذرائع ہوتے ہیں۔ ایسے ابنِ سقراط پر سب سے پہلے مذہب مخالف ہونے کا الزام آراستہ کیا جاتا ہے تاکہ عوام کوئی اور بات سننے کے لئے تیار ہی نہ ہو اور پھر ایسا ہی ہوتا ہے کہ اگر زمین ساکن ہے تو کیوں عوام کو بتایا جائے کہ زمین گھومتی ہے:

"ہم آپ کے خیالات کی عزت کرتے ہیں، آخر وہ آپ کے استاد تھے۔ مگر ابھی آپ طفلِ مکتب تھے شاید یہ بھول بیٹھے ہیں کہ اُس نے شہنشاہیت کے ساتھ کس قدر ٹکر لینے کی کوشش کی تھی، اُس کے خیالات نے یونان کی گلیوں میں بغاوت کی آگ بھڑکا دی تھی، شاہی فرمانوں کی وُقعت ایک تنکے کے برابر رہ گئی تھی، وہ بادشاہ سے بڑا بادشاہ بن کر اُبھر رہا تھا، اس لیے اُس کا انجام عوام کے لیے عبرت کا نشان بنا دیا گیا۔" (۸)

اچھے استاد کے لیے سب سے ضروری ایک اچھا دماغ ہے کیونکہ ایک اچھا ظروف ساز یا مصور سب سے پہلے ذہن میں برتن کے خدوخال بناتا ہے، اس کے بعد اس کو عملی شکل دینے کے عملی اقدامات کرتا ہے۔ اس کے بعد ہی اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مصور نے اس پر کتنی محنت کی ہے، مصور کو اپنے کام پر کتنی مہارت ہے اور اپنے کام سے کتنا پیار ہے۔ اسی لیے ایک اچھے استاد کے لیے طالب علموں سے مخلص، جدید نظریات کا مطالعہ، تعلیمی مہارتوں پر عبور، کتاب سے رغبت، نئے رجحانات سے واقف ہونا ضروری ہے۔ ایک اچھے استاد کے لیے اپنے ملک کی سیاست کا بھی وسیع مطالعہ ہونا چاہیے تاکہ وہ جان سکے اور طالب علموں کو بتا سکے کہ ان کے راہ نما ان کی بہتر زندگی کے لیے تعلیم کے میدان میں کیا اقدامات کر رہے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ حکمران عوام کو صرف نعرے بازی تک ہی محدود کر دیں۔ کیونکہ کسی قوم کو پست رکھنے میں بھی ناقص تعلیم اہم کردار ادا کرتی ہے۔ تعلیم کے نام پر اربوں روپوں کی کرپشن کی جاتی ہے، نئی یونیورسٹیوں کے قیام کا خواب دکھایا جاتا ہے، عوام کو بیوقوف بنانے کے لئے متاثر کن نعرے تخلیق کیے جاتے ہیں اور بتایا جاتا

ہے کہ جو شخص اپنا نام لکھ اور پڑھ سکتا ہے وہ تعلیم یافتہ ہے۔ نصاب پڑھانے کے لیے علاقائی زبانوں کے میڈیم کو استعمال کیا جاتا ہے جس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ایک اچھا خاصا تعلیم یافتہ شخص اور ان پڑھ شخص کے ذہن میں کوئی فرق نہیں رہتا اور اس میں صرف اور صرف نام نہاد حکمران کا فائدہ ہے۔ شاہد صدیقی نے ناول میں اچھی اور ناقص تعلیم کی خوبیوں خامیوں کو بیان کرنے کرنے کے لئے Paulo Freire کے نظریات کو بھی اپنے ناول کا حصہ بنایا ہے کہ کیسے تعلیم سماج میں تبدیلی اور سوال کا ذریعہ بنتی ہے:

"آج کل فنکشنل لٹریسی پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جا رہا ہے لیکن معاشرے میں تبدیلی کے لیے کرپٹیکل لٹریسی کی ضرورت ہے۔ پولو فریرے Paulo Freire جیسے لوگوں نے ثابت کیا ہے کہ لٹریسی کو معاشرے میں تبدیلی کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے بھی تعلیم کے کرپٹیکل پہلو سے دلچسپی ہے۔ ایک ایسی تعلیم جو نیوٹرل اور Passive نہ ہو بلکہ معاشرے کے دل میں دھڑک رہی ہو۔ میں نے کہا کہ تعلیم اور آئیڈیالوجی کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ تعلیم ایک قوم کو سلا بھی سکتی ہے اور بیدار بھی کر سکتی ہے۔ یہ معاشرے کی سماجی اور معاشی تفریق کو بڑھا بھی سکتی ہے اور کم کرنے میں بھی معاون بھی ثابت ہو سکتی ہے۔" (۹)

یہ درست ہے کہ تعلیم کسی بھی قوم کو سلا بھی سکتی ہے اور بیدار بھی کر سکتی ہے۔ اب یہ صرف حکمرانوں کی پالیسیوں پر ہی منحصر ہے کہ وہ اپنی قوم کو سلاتے ہیں یا بیدار کرتے ہیں۔ کس ملک کے حکمران اپنی قوم کو ناقص تعلیم دے کر عوام کے ذہن کو ہمیشہ کے لیے دقیانوسی خیالات میں دفن کر دیں اور کس ملک کے حکمران اپنی قوم کو اچھی تعلیم دے کر ستاروں کو بھی اپنے پاؤں کی گرد بنا دے۔ کون مریخ اور خلا کو مسخر کرتا ہے؟ کون کرونا ویکسین پہلے بناتا ہے؟ ڈاکٹر ذاکر حسین بیان کرتے ہیں:

"استاد کی کتاب زندگی کے سرورق پر "علم نہیں لکھا ہوتا" محبت کا عنوان ہوتا ہے۔ اسے انسانوں سے محبت ہوتی ہے، سماج جن خوبیوں کا حامل ہے ان سے محبت ہوتی ہے۔" (۱۰)

جن ممالک میں بادشاہی نظام، آمریت اور آمرانہ رویے ہیں وہاں عوام کی تعلیمی حالت اور بھی دگرگوں ہے۔ تیسری دنیا کے بیشتر مسلم ممالک کی صورت حال تعلیم کے میدان میں انتہائی تشویش ناک ہے۔ کیونکہ ناقص تعلیم حکمرانوں کے پائیدار اقتدار کا باعث ہے۔ ایسی تعلیم سوچنے، سمجھنے اور غور و فکر جیسی صلاحیتوں سے قاصر ہوتی ہے۔ لائق اور باصلاحیت اساتذہ کا تقرر نہیں ہوتا ہے، بلکہ اگر کوئی ایسا اساتذہ خوش قسمتی سے آ ئے بھی جائے تو بہت جلد اُس کے خلاف ایک ایسی لابی تیار ہو جاتی ہے کہ وہ یا تو کسی بڑی مصیبت کا شکار ہو جاتا ہے یا خود کسی بڑے خطرے کو بھانپ کر تعلیم سے اپنا ناطہ توڑ کر کسی اور شعبے میں قسمت آزمائی کرتا ہے۔ اگر کوئی لائق استاد کسی یونیورسٹی میں کسی کی تعلیمی کرپشن کو بے نقاب کرے تو اس کی بات کو سنا نہیں جاتا بلکہ تعلیمی کرپشن پر آواز اٹھانے والے استاد ہی کو نوکری سے فارغ کر دیا جاتا ہے۔ جن ممالک کی تعلیم وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہوتی وہاں بے روزگاری کے خونی پنجے بہت مستحکم اور بے رحم ہوتے ہیں۔ کیونکہ ناقص تعلیم یافتہ کو نہ تو اپنے ملک میں کوئی باعزت روزگار حاصل ہوتا ہے بلکہ بیرون ملک میں تو اس

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور یہ ہی سوال کی موت کا عمدہ طریقہ ہے۔ لائق اساتذہ پر ہمیشہ منفی پروپیگنڈہ، مذہب مخالف اور غدار ہونے کا الزام عائد کیا جاتا ہے کیونکہ حکمران طبقہ اس بات سے بخوبی واقف ہوتا ہے کہ ہماری یہ باتیں عوام کے ذہنوں پر ایک نشہ کا سا اثر کریں گی اور اس طرح ہماری جیت بآسانی ہو سکے گی۔ ڈاکٹر حمیرا اشفاق نے اسی فضا کو اپنے سیاسی علامتی افسانے "ابنِ سقراط" میں بیان کیا ہے۔ ابنِ سقراط پر بھی علم کی دیویاں قابض ہو گئی تھیں اس لئے اس کو سزا دینا ضروری تھا۔ وزیروں کی دلیل میں کیسے کوئی شک کرتا کہ اگر زمین گھومتی تو ہم سب بھی تو گھوم رہے ہوتے، آس پاس کی ساری اشیا بھی تو گھومتی نظر آتیں۔ حکمران طبقے کا جوابی پروپیگنڈہ ایسا ہی موثر ہوتا ہے۔ اس لئے ایسے اساتذہ کو سزا دینا ضروری ہے کیونکہ اس نے اُس دروازے پر دستک دی ہے جس کی طرف جانے کی بھی ممانعت ہے:

"اب ایک آٹھ کے فیصلے سے ابنِ سقراط کے جرم کا فیصلہ ہو چکا تھا، بادشاہ نے کہا، عمر قید بھی اس مسئلے کا حل نہیں کیونکہ یہ زندہ رہا تو دوسروں کو ان سوالوں پر اُکساتا رہے گا جن کا جواب ہمارے پاس نہیں ہے، کتنوں کو موت کے گھاٹ اُتاریں گے، اس لیے اس کی موت ضروری ہے تاکہ سوال کی موت ہو۔" (۱۱)

شاہد صدیقی کے ناول کا مرکزی کردار سہارن رائے بھی ایک ایسا استاد تھا جو لائق، اہل علم اور باصلاحیت تھا، جو زنگ آلود طالب علموں کی صلاحیتوں کو نکھارنے میں مصروف عمل تھا۔ اپنے طالب علموں کو دنیا کے ترقی یافتہ اقوام کے برابر لانا چاہتا تھا، جو جدید نظریات کا پرچار کرتا تھا تاکہ ذہنوں پر چھائی صدیوں پرانی کائی کو ہٹایا جا سکے، جس کی تہہ سے ایک ایسا سماج برآمد ہو گا جو امن کا گہوارہ ہو گا، جہاں نفرتیں نہیں ہوں گی، حسد کا کوئی کام نہیں ہو گا، دھونس، دھمکی، کینہ، غنڈہ گردی، دہشت گردی، ٹارگٹ کلنگ، بم بارود اور وحشت کا نام ونشان نہیں ہو گا۔ جہاں پر عوام ہر طرح کی غلامی کا طوق توڑ دیں گے۔ جہاں صرف "خلقِ خدا" حکمران ہو گی۔ نام نہاد سامراجیت کی پہچان بآسانی ہو سکے گی جو عوام کش پالیسیاں بناتے ہیں اور عوام کو گھٹن زدہ ماحول میں زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ عام لوگوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا ہے۔ عوام کو متاثر کن نعروں کے نام پر چینی جیسی میٹھی گولی کھلائی جاتی ہے جو مستنصر حسین تارڑ کے "نئے آدم" کی موت کا سبب بنتی ہے۔ استاد ایک ایسا سماج چاہتا ہے جہاں علم وادب سے محبت ہو، جہاں لوگوں کی جیبوں میں قلم ہو اور جب یہ قلم کسی مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جائے تو اس کا قلم، کلاشنکوف، بم یا آتشی اسلحہ رکھنے سے زیادہ سنگین جرم نہ ہو، اساتذہ کو رسوا نہ کیا جائے، عوام کو باشعور بنانے پر ہتھکڑیاں نہ پہنائی جائیں، حراست میں نہ رکھا جائے۔ عوام کے لیے لکھی گئی اساتذہ کی کتب جرم تصور نہ کی جائیں اور ایسا سماج جہاں پر استاد کو دیکھ کر جج بھی تعظیم کے لیے کھڑا ہو جائے۔ لوگوں کو اپنے حقوق کا پتا ہو، لوگ آواز اٹھانا جانتے ہوں، سوال کرنا جانتا ہوں، سہارن رائے بھی ایک ایسا ہی سماج چاہتا تھا لیکن پھر اچانک ایک فون کال آ گئی:

"میرے ایک شاگرد نے جو آج کل پولیس کے ایک اہم عہدے پر فائز ہیں فون کیا ہے اور مجھے محتاط رہنے کا کہا ہے "سر! براہ مہربانی آپ محتاط رہیں، میں نے آپ کا نام اس فہرست میں دیکھا ہے جو حکومت کا پہلا نشانہ ہوں گے۔" (۱۲)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

استاد اور معیاری تعلیم کی ضرورت تیسری دنیا کو آج کے دور میں سب سے زیادہ ہے۔ کیونکہ آج کے دور میں آمرانہ رویے تیسری دنیا کے سادہ دل عوام کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہیں، یہ خطرہ اس لیے سنگین ہے کہ یہ استاد اور علم کی موت چاہتے ہیں تاکہ سوال کی موت ہو سکے۔ تیسری دنیا کے ممالک کی عوام نے اگر ان شاطروں کی استاد اور علم دشمنی پالیسیوں کو مسترد نہیں کیا تو مستقبل میں عوام کی زندگی صرف ایک جانور کی سی ہو گی جہاں چاہو لے جاؤ، رکھو، بیچ دو، مار دو۔ ابدی غلام جو مسولینی کے مظالم سے بھی کہیں زیادہ ہولناک اور بھیانک ہو گی۔ اس ساری داستان کے پس منظر کو "ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ" میں بھی پڑھا جا سکتا ہے:

> "وہ صرف اس لئے عیش کر رہے ہیں کہ قوم جاہل ہے۔ چونکہ ایلیٹ کلاس جو سول۔۔۔۔ بیوروکریسی پر مشتمل ہے اور اس کے ڈانڈے اس ملک کے فیوڈل کلاس سے جڑے ہیں، وہ خود اپنی جگہ پر جدید طرز زندگی کے سارے لوازمات سے لطف اندوز ہوتے ہیں، لیکن میڈیا، تعلیمی نصاب اور قومی پالیسیوں کے ذریعے ان کی بھرپور کوشش ہے کہ عوام قدیم، رجعت پسند اور متروک نظریات کے شکنجے سے ہر گز آزاد نہ ہونے پائیں۔" (۱۳)

ابنِ سقراط کی سزا کا فیصلہ ہو چکا تھا، دربان حاضر ہوتا ہے جس کو سقراط کو اندر لانے کا حکم ملا ہے۔ زنجیروں میں جکڑا ابنِ سقراط پُر سکون چہرے کے ساتھ جیوری کے سامنے پیش ہوتا ہے۔ بہت ساری سزائیں تجویز ہونے لگیں سنگسار کیا جائے، جلا دیا جائے، دو ٹکروں میں تقسیم کیا جائے۔ اتنی سخت سزائیں دینے پر بھی جیوری کو لگ رہا تھا کہ سوال کو کچلا نہیں جا سکے گا۔ اس لیے سزا سر عام موت کے گھاٹ اتارنے پر منکف ہوئی، ابنِ سقراط کو عوام کے حوالے کرنے پر بھی غور و فکر ہوا۔ لیکن جب وزیر نے کہا کہ عوام کے پاس آنکھیں ہیں وہ اس کو کیوں مارے گی تو شہنشاہ معنی خیز جواب دیتا ہے:

> "بادشاہ نے اٹل انداز میں کہا: ہاں عوام کے پاس آنکھیں ہیں لیکن ہم نے اُن کی روشنائی ان کے دماغوں تک پہنچنے ہی نہیں دی۔ کوئی آخری خواہش ابنِ سقراط؟" (۱۴)

تیسری دنیا کے اکثر ممالک ایسی صورت حال سے دوچار ہیں۔ جہاں عوام کی پسماندگی میں معیاری تعلیم، نصاب اور اچھے اساتذہ کا نہ ہونے کا اہم کردار ہے۔ اور اس صورت حال سے نکلنا بھی بہت ضروری ہے لیکن اس سے نکلنے کے لئے معیاری تعلیم ہی واحد راستہ دکھائی دیتی ہے۔ تعلیم ہی سماج میں ایک مستحکم اور دائمی انقلاب کی ضامن ہو سکتی ہے۔ پروفیسر سہارن رائے بھی اپنے طالب علموں کو ایسی ہی حقیقتوں سے آشنا کر رہے تھے جس کے لیے سہارن رائے کو اپنی جان کی قیمت ادا کرنا پڑی:

> "میں نے جلدی سے ٹی وی آن کیا۔ ملک کے مشہور ٹی وی چینل پر خبر آ رہی تھی۔ وقفے وقفے سے پروفیسر رائے کی وہ تصویر دکھائی جا رہی تھی جس میں اُن کے لمبے بال خون میں بھیگ کر چہرے سے چمٹ رہے تھے۔ اُن کی پیشانی پر پولیس کی لاٹھیوں سے گہرے

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

گھاؤ آئے تھے۔ وہ بے ہوش تھے۔۔۔ آخری اطلاع کے مطابق انہیں ICU میں رکھا گیا تھا" (۱۵)

تعلیم کی سیاست کے اثرات کو ان الفاظ میں مرتب کیا جا سکتا ہے:

۱۔ معیاری تعلیم سے ہی حقیقی انقلاب ممکن ہے۔ اس کے بغیر قومی ترقی ناممکن ہے۔

۲۔ غیر معیاری تعلیم سے کسی بھی قوم کے ذہن کو سلانا بہت آسان ہوتا ہے۔

۳۔ معیاری تعلیم سے ہی مثبت مزاحمت پیدا ہوتی ہے۔

۴۔ ناقص تعلیم معاشی عدم مساوات اور طبقاتی کشیدگی اور تصادم کو جنم دیتے ہیں اور اشرافیہ نہیں چاہتے کہ معاشی اور سماجی ناہمواریاں ختم ہوں۔

۵۔ تعلیم کو اگر سامراجی قوتوں بطور ہتھیار استعمال کر سکتے ہیں تو تعلیم مزاحمت کے طور پر بھی استعمال ہو سکتی ہے۔

۶۔ کتاب پڑھنے کی لذت اب اساتذہ میں ختم ہو گئی ہے۔

۷۔ اگر سب کچھ پہلے سے لوح محفوظ پر لکھا جا چکا ہے تو کیا تیسری دنیا میں ناقص تعلیم اور اس کے سبب معاشی پسماندگی بھی لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہے۔

۸۔ خواندگی کی سیاست کسی بھی قوم پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہیں۔ تیسرے دنیا کے مسلم ممالک میں خواندگی کا مقصد صرف اور صرف اپنا نام لکھنا اور پڑھنے کی حد تک ہے جس سے فیوڈل کلاس کے لیے عوام پر حکمرانی کا عمل اور گہرا ہو جاتا ہے اور یوں غلامی کا طوق ساری زندگی کی قسمت بن جاتا ہے۔

۹۔ اچھا استاد کون ہے؟ جو کلاس میں پڑھائے بغیر طالب علموں کو A گریڈ دے یا جو علم، مہارت، ٹیکنیک، مکالمہ نگاری کی مہارت، کیمونیکیشن، سبجیکٹ نالج، طریقہ تدریس میں اچھا ہو؟

۱۰۔ علم، طریقہ تدریس اور طالب علموں کے ساتھ اچھا رویہ ہی ایک اچھے استاد کے تین رخ ہیں۔

۱۱۔ تعلیم اور معاشرے میں ربط ضروری ہے۔

۱۲۔ کسی قوم کی ترقی کشادہ سڑکوں اور بلند و بالا عمارتوں سے نہیں بلکہ صحت، معیاری تعلیم اور آزادی اظہار رائے میں ہے۔

ڈاکٹر حمیرا اشفاق نے افسانہ ”ابنِ سقراط“ اور شاہد صدیقی نے اپنے ناول ”آدھے ادھورے خواب“ میں استاد، معیاری علم اور سوال کی اہمیت کو بیان کیا ہے۔ علم سے ہی سماج میں مثبت بہتری لائی جا سکتی ہے۔ اچھے استاد اور معیاری تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے تیسری دنیا کے بہت سے ممالک کی عوام کی زندگی حیوانوں سے بھی بدتر ہے۔ ایلیٹ کلاس، فیوڈل طبقہ اور حکومتیں ایسی پالیسیاں تیار کرتی ہیں جو ساری زندگی عوام کو رجعت پسند اور دقیانوسی خیالات اور نظریات کی بھینٹ چڑھائے رکھے۔ سیاسی سماجی معاملات کے درست

حقائق تک ایسی عوام کے ذہنوں میں کبھی کوئی بات داخل نہیں ہو پاتی۔ تمام غیر ملکی دانشور مذہب اور ملک کا دشمن قرار دیے جاتے ہیں تاکہ ان کی تحریروں، انٹرویوز اور کتب کا مطالعہ نہ کریں۔ حکومتوں کی ساری کوشش اور بجٹ اس پر خرچ کیا جاتا ہے کہ ہم کیسے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر عوام کو اندھیرے میں رکھ سکتے ہیں۔ ایسے معاشروں اور ملکوں میں صرف مشینی استاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ عوام کو سوچ دینے، سوال کرنے، معیاری تعلیم پر اکسانے، تعلیم اور معاشرے کا تعلق عوام سے جوڑنے، سیاسی سمجھ بوجھ سے آشنا کرنے اور ملکی اداروں کی خود مختاری کا خواب عوام کو دکھانا ملک سے بغاوت کے زمرے میں آتا ہے۔ اس لیے ایسے اساتذہ کرام کو سخت سے سخت سزائیں دی جاتی ہیں، اغوا کیے جاتے ہیں، بھوئیں، مونچھیں اور سر کے بال کاٹ دیے جاتے ہیں، ہونٹ اور دانت توڑ دیے جاتے ہیں اور ایسا تشدد کیا جاتا ہے کہ تشدد کے بعد ان میں سے بعض اپنے عزیز طالب علموں کو تو کیا اپنے خونی رشتوں کی پہچان بھی حافظے سے محو ہو جاتی ہے۔ اگر اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی کوئی کسر رہ جاتی ہے تو ابنِ سقراط اور پروفیسر سہارن رائے کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے تاکہ سوال کی موت ہو جائے۔ استاد اور سوال کی موت کا جو سلسلہ سقراط سے شروع ہوا تھا وہ آج اکیسویں صدی میں بھی ہنوز جاری ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ جیکولین آسٹن، پروفیسر، سرسید تعلیم کانفرنس" مشمولہ: روزنامہ جنگ، لاہور، ۲۴ جولائی ۲۰۲۱ء، ص، ۱۱

۲۔ سٹیفن پی کوہن، پاکستان کا مستقبل، مترجم، ہما انور، جمہوری پبلیکیشنز، سن، ۲۰۱۱ء، ص، ۴۲

۳۔ حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، کتبوں کے درمیان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور سن، ۲۰۱۹ء، ص، ۱۲۶

۴۔ شاہد صدیقی، آدھے ادھورے خواب، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص، ۱۷

۵۔ حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، کتبوں کے درمیان، ص، ۱۲۸

۶۔ شاہد صدیقی، آدھے ادھورے خواب، ص، ۳۶، ۳۵

۷۔ مسعود الحق، تعلیم، سماج، استاد، حرا پبلیکیشنز، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء، ص، ۲۲

۸۔ حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، کتبوں کے درمیان، ص، ۱۲۸

۹۔ شاہد صدیقی، آدھے ادھورے خواب، ص، ۴۲

۱۰۔ ذاکر حسین، ڈاکٹر، تعلیمی خطبات، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ جامعہ نگر، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص، ۱۰۷

۱۱۔ حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، کتبوں کے درمیان، ص، ۱۳۰

۱۲۔ شاہد صدیقی، آدھے ادھورے خواب، ص، ۹۱

۱۳۔ ارشد محمود، ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص، ۲۰، ۲۱

۱۴۔ حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، کتبوں کے درمیان، ص، ۱۳۱

۱۵۔ شاہد صدیقی، آدھے ادھورے خواب، ص، ۱۳۰

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024
تحقیقی وتنقیدی مجلہ
دریافت

References in Roman Script:

1. Jacqueline Austin, Professor, ''Sir Syed Taaleem Conference)'' Mazmoon) Mashmola: roznama jang, Lahore, 24 July, 2021, P. 11
2. Stephan p Kohan, Pakistan ka mustaqbil, mutarjam: Huma anwar, Jamhori Publications, 2011, P. 42
3. Humera Ishfaq, Dr., Katboon key Darmiyan, Sang-e-meel, publication, Lahore, 2019, P. 126
4. Shahid Siddiqui, Aadhay Adhoray Khab, National Book Foundation, Islamabad, 2016, P. 17
5. Humera Ishfaq, Dr., Katboon key Darmiyan, P. 128
6. Shahid Siddiqui, Aadhay Adhoray Khab, P. 35, 36
7. Masood ul Haq, Taaleem, samaj, ustad, Hira publications, New Delhi, 2002, P. 22
8. Humera Ishfaq, Dr., Katboon key Darmiyan, P. 128
9. Shahid Siddiqui, Aadhay Adhoray Khab, P. 42
10. Zakar Hussain, Dr., Taaleem Khutbaat, jamah limited, Dehli, 2012, P. 107
11. Humera Ishfaq, Dr., Katboon key Darmiyan, P. 130
12. Shahid Siddiqui, Aadhay Adhoray Khab, P. 91
13. Arshad Mahmood, Saqafity Ghutan aur Pakistani mashra, Fiction House, Lahore, 2019, P. 20, 21
14. Humera Ishfaq, Dr., Katboon key Darmiyan, P. 131
15. Shahid Siddiqui, Aadhay Adhoray Khab, P. 130

Dr. Muhammad Sohail Iqbal completed his Ph.D. in Urdu from the International Islamic University, Islamabad, Pakistan. He has authored 15 articles in esteemed journals. His current research interests include thematic and structural analyses in Urdu fiction and prose.

Dr. Muhammad Rashid Iqbal is an Assistant Professor in the Department of Urdu at Government Islamia Graduate College, Kasur, Pakistan. He earned his Ph.D. in Urdu from Punjab University, Lahore, Pakistan, specializing in Fiction. He has authored 14 articles and received a Gold Medal for his academic achievements. His research interests include cultural and literary aspects of Urdu fiction.

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلہ
دریافت

Received: 11th Aug, 2024 | Accepted: 15th Dec, 2024 | Available Online: 31st Dec, 2024
Digital Object Identifier: 10.52015/daryaft.v16i02.398

"انواسی": اثبات مرگ کا اظہاریہ

"Anwasi": An Affirmation of Death

DR. ABIDA NASEEM
Lecturer, Department of Urdu, University of Sargodha, Pakistan
(abidanaseem321@gmail.com)

ABSTRACT There is a popular trend to present woman as a topic through novels. These novels presents different social behaviors towards woman's role and value in a society. Sometimes the presentation of this topic shows reverse approach of the writers. In this context these novels reflects character assassination of a women through their approach. Anwasi is also a novel like this which addresses the role of a significant woman of the Punjab in 19th century. Characteristic study of this novel shows that writer has destroyed the character of sungri through his non constructive approach. This approach devalued the female character and she seemed like fake and unrealistic. This novel presents a spoiled perspective of this women. In this article the researcher tried to comprehend the approach of writer to assassinate the women character.

Keywords: Novel Anwasi, characteristic study, character assassination of a female character sungri.

اکیسویں صدی کا سیاق جمہوریت، انسان دوستی، انسانی شعور کی بیداری، وسیع تر آزادی اور عالم گیریت سے متشکل ہوا ہے۔ دنیا بھر میں زباں بندی اور استحصال کے خلاف آزادی اظہار اور حقوق کی پاسداری کی گونج ہے۔ جدید علوم وفنون طاقت کے وسیع بیانیے میں ہر دو فریقین کی حقیقت ونوعیت اور صورت گری کی تفہیم سے ہی متشکل ہوئے ہیں۔ علم وہنر کی ریل پیل کے اس منظر نامے میں جدید اردو فکشن نے بھی خوب استفادہ کیا ہے۔ گزشتہ دو دہائیوں میں اردو ناول کی تخلیق اور تحقیق و تنقید میں گراں قدر تغیرات اور تنوعات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ معاصر اردو ناول نے بھی یہاں کے سماجی و ثقافتی بیانیے میں موجود ثنویت و امتیاز، مختلف سماجی اکائیوں کی معدومیت اور ان کی بے داری کی جدوجہد، مقتدر بیانیوں کے طریقہ ہائے کار اور حکمت عملیوں اور اس منظر نامے کو متشکل کرنے والے داخلی وخارجی عوامل کی پیشکش سے اپنا خمیر اٹھایا ہے۔ جدید فکشن کا مسالہ بننے والے یہ حقائق اور ان کے اسباب وعلل کوئی نئی بات نہیں ہیں۔ یہ تمام مسالہ ایک متوازی بیانیے کی صورت میڈیا اور سوشل میڈیا کی تیز ترین ترسیل کے سبب ہمہ یا تخلیقی صلاحیت کافی نہیں، اس میں شعور، نظر، تجربہ اور تجربے سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت اور ان سب سے بڑھ کر ان مشاہدات کو انسانی مزاج ومذاق سے ہم آہنگ یا گھلا ملا دینے کی صلاحیت ضروری ہے۔[1] محمد حفیظ خان کا ناول "انواسی" ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا ہے۔ "انواسی" ایک ایسا ناول ہے جو انیسویں صدی کے سیاسی وسماجی تناظر میں رہتے ہوئے مقامی عورت کے ایک مخصوص کردار کی نمائندگی کے لیے لکھا گیا ہے۔ ناول کی پیش کاری کے لیے جو فارمولا مصنف کے پیش نظر رہا ہے اس کے مطابق کسی خاص عہد کی روح کو کسی ایک کردار کے توسط سے منعکس کیا

This work is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

جاتا ہے۔ جیسے "امراؤ جان ادا" میں امراؤ جان یا جیسے "آنگن" میں عالیہ کا کردار وغیرہ۔ گویا مصنف نے اس نسوانی کردار کی مدد سے انیسویں صدی کی وسطی دہائی میں پنجاب کے ایک مخصوص لوکیل کی زندگی کو ایک عورت کے توسط سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس مرکزی کردار کا نام سنگری ہے، سنگری کے لیے ہی مصنف نے انواسی کا لفظ برتا ہے جو ناول کا عنوان بھی ہے۔ کہانی کا لوکیل دریائے ستلج کے کنارے ریاست بہاولپور اور ملتان کی سرحد پر واقع ایک قصبہ آدم واہن کے گرد گھومتا ہے، جہاں ۱۸۷۲ء میں کراچی کو لاہور سے ملانے والی ریلوے لائن کو مکمل کرنے کے لیے دریائے ستلج پر پل بچھانے کا واقعہ موضوع بنایا گیا ہے۔ ریلوے کمپنی کی جانب سے جو نقشہ ڈیزائن کیا گیا اس کے مطابق پل بچھانے کے لیے بستی کے قدیمی قبرستان کو مسمار کر کے نئی جگہ منتقل کرنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ پرکھوں کی ہڈیوں اور اپنی جڑوں کی اس سفاکانہ منتقلی کے خلاف معدودے چند افراد ہی مزاحمت کرتے ہیں جن میں سے ایک سیدا بھی ہے۔ سیدا ایک کڑیل جوان ہے اور سنگری اس کی منکوحہ ہے۔ سنگری ایک بھرپور عورت ہے اور اپنی نسوانیت کا اثبات چاہتی ہے اس کے لیے وہ وقتاً فوقتاً سیدے کی مردانگی کو للکارتی رہتی ہے، مگر سیدے کے دماغ میں قبرستان کی منتقلی کی پھانس اٹکی رہتی ہے۔ بالآخر ایک دن اس کی مردانہ انا جوش میں آجاتی ہے اور وہ سنگری سے متشددانہ جنسی ملاپ کرتا ہے۔ سیدا چونکہ انگریزوں کو مطلوب تھا، ہر جگہ اس کی تلاش ہے اس لیے وہ منظر سے غائب ہو جاتا ہے اور کہانی کے انجام تک نظر نہیں آتا۔ ریلوے کمپنی اور انگریز حکام مسجد کے ملا کو آلہ کار بنا کر قبروں کی منتقلی سے متعلق فتویٰ لے لیتے ہیں اور پل کی تعمیر ممکن بنالی جاتی ہے۔ حاملہ سنگری ملا کی طاقت اور اثر ورسوخ کو استعمال کرنے کے لیے اس سے نکاح کر لیتی ہے اور چھ ماہ بیٹے کی ماں بن جاتی ہے۔ مشتعل عوام کے ہاتھوں ملا کے قتل کے بعد اس کے چھوٹے بھائی سے نکاح کر لیتی ہے، وہ دوروز میں ہی اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد سنگری ملا کے بڑے بیٹے کو اپنی جانب راغب کر لیتی ہے تاکہ اسے آسائش زندگی میسر رہے۔ اسی دوران بستی میں ایک بہت بڑا سیلاب آجاتا ہے اور بستی دریا برد ہو جاتی ہے، سنگری اس سیلاب کی نذر ہو جاتی ہے البتہ اس کا بچہ ایک عزیز لے جاتا ہے۔

مصنف نے سنگری کو ایک غیر معمولی اور باشعور عورت بنانے کی کوشش کی ہے۔ سنگری نہ صرف مقامی عورت کی نمائندہ ہے بلکہ مصنف نے اسے یہاں کی دھرتی کا ایک استعارہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ سنگری کے لیے مقامی لغت کا لفظ انواسی مستعار لیا گیا ہے۔ ناول کے دیباچے میں مصنف نے وضاحت کی ہے کہ انواسی جنسی طور پر کنگال عورت کو کہتے ہیں۔ لغت میں انواسی کا مطلب جسمانی طور پر برتی ہوئی (کھنگالی ہوئی) یا شادی شدہ عورت مراد ہے[۲] ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ناول میں سنگری کے کردار کی تشکیل اسی لفظ میں معنی بھرنے کے واسطے کی گئی ہے۔ ذیل میں سنگری کے اس کردار کی کچھ جہات کی تفہیم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ناول کی ابتدا میں سنگری ایک غیر معمولی اور باشعور عورت کے طور پر سامنے آتی ہے۔ قاری اس کردار سے متاثر ہوتا ہے اور اس کی کرداری اٹھان کی توقع کرنے لگتا ہے۔ ناول کی ابتدا میں مصنف نے بتایا ہے کہ مقامی دانش کے مطابق بستی میں طاقت اور مردانگی کے مظاہرے کے دو مرغوب اظہاریے تھے۔ ایک جوان لڑکی کو بھگا کر لے جانا اور دوسرا گائے بھینس کی چوری کرنا۔ بعض صورتوں میں تو بھینس کی چوری لڑکی کی چوری سے بھی زیادہ گردانی جاتی تھی۔۔۔۔ باسیوں کو یقین تھا کہ جس طرح بڑے بڑے زرخیز تھنوں اور لانبی سیاہ آنکھوں والی چٹی گوری لڑکیاں اغوا ہو کر ہی رہتی ہیں اسی طرح لشکارے مارتی سیاہ بھینسیں اور دودھ سے

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024
تحقیقی و تنقیدی مجلہ
دریافت

بھرے تھنوں والی گائیں بھی پر ایا دھن ہی ہوتی ہیں۔[۳] اس سیاق میں سنگری نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا۔ سیدے کا نسبتی ٹھپہ اس کی شناخت تھا، وہ سیدے کے ملکیتی حصار میں قید تھی اور مامون تھی۔ اس کی ماں کہتی ہے کہ اگر وہ سیدے کی منگ نہ ہوتی تو کب کی اغوا ہو جاتی[۴] سیدے کے شناختی خول میں لپٹی سنگری کی کرداری اٹھان کا تعین تو اس کے افعال کریں گے، مگر مصنف نے اس کی جسمانی اٹھان کو خاصی محنت سے پیش کیا ہے اور اردو غزل کا پورا باب تازہ کر دیا ہے۔[۵]

ایک بولتے ہوئے سراپے والی زندگی سے معمور لڑکی کی یہی جسمانی اٹھان جب ترنگ بن کر اس کے سراپے میں دوڑنے لگی تو سیدے کا حفاظتی بندھن بیزاری اور جھنجلاہٹ بن کر اس کے اعصاب پر طاری ہو گیا۔ شعور کی بیداری اور عرفان ذات کی جستجو کا یہ روپ سنگری کو ایک زندہ، توانا اور فطری عورت کا کردار دیتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے شخصی آزادانہ استحقاق کو آزمانا چاہتی ہے۔ مروجہ ثقافتی بیانیے کی عطا کردہ نسبتی توقیر اسے کھلتی ہے، وہ اس رعایتی وقار سے نامطمئن نظر آتی ہے۔ اپنے جذباتی اور جسمانی کردار کی آگہی کی طلب اس میں شدت سے امنگ بھرتی ہے کہ وہ اغوا ہو جائے یا وہ کسی کے ساتھ بھاگ جائے۔ بالآخر وہ سرراہ سیدے کی غیرت کو للکارتی ہے کہ وہ اسے مکلاتا کیوں نہیں ہے، کیا اسے کسی اور کے لیے چھوڑ دے گا۔ کردار کو عظمت دینے کے لیے یہ للکار دیتے ہوئے مصنف نے اس کا سراپا یوں بیان کیا ہے۔۔ پوہ کی گہری ہوتی ہوئی شام میں سرسوں کی پھندنی جیسی پیلی چولی اور سرخ رنگ کی گھاگھری پہنے ہوئے۔ اس کا چہرہ زرد اور آنکھوں کا کاجل آنسوؤں سے بھیگا ہوا، وہ سیدے کے انتہائی قریب آگئی اتنی کہ اس کے بدن سے اٹھتی ہوئی جوانی کی مہک اس کے نتھنوں میں بپھرے ہوئے بیل جیسی وحشت جگانے لگی۔۔۔ سنا ہے تو مرنا چاہتا ہے گوروں کے ہاتھوں۔[۶]

انیسویں صدی کی غیر لچک دار اور صنفی امتیاز کی حامل اقداری تشکیل کے تناظر میں مقامی عورت کا یہ اقدام اسے جرات آموزی اور بلندی کردار عطا کرتا ہے، مگر یہ جسارت کردار سے بے خوفی، ارادے کی پختگی اور اپنی دنیا آپ بسانے کی بصیرت کی طالب ہے۔ مصنف نے للکار دیتی ہوئی جو عورت دکھائی ہے یہ تو اس دھرتی کی فراق زدہ مقامی عورت کا سراپا ہے جس کے گال کی سرخی اور آنکھ کی چمک کو وصال کی کسک نے چاٹ لیا ہو۔ یہ سراپا مرد کو للکارنے والی آن اور تمکنت سے محروم نظر آتا ہے۔ یہ تو چرنوں میں دان کرنے والی داسی کا روپ ہے۔

بہر حال سنگری کی طرف سے خواہش کے یوں بے مہابا اظہار کا جواب وقار زدگی کی لپیٹ میں آئے ہوئے سیدے کی جانب سے ایک زوردار تھپڑ کی صورت دیا جاتا ہے۔ یہاں سنگری کا کردار پلٹا کھاتا ہے اور وہ اپنی امنگوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس ہتک کا بدلہ لینے پر تل جاتی ہے۔ یہاں تک سنگری کا کردار مائل بہ ارتفاع نظر آتا ہے۔ قاری محسوس کرتا ہے کہ ایک عورت کی نسوانی انا مقامی مرد اساس اقداری معیارات کی پاسداری کے باعث مجروح ہوئی ہے۔ قاری سنگری سے ایک غیر معمولی رد عمل کی توقع کرنے لگتا ہے۔ غصہ ٹھنڈا ہونے کے بعد جب سیدا سنگری کو مکلانے جاتا ہے تو وہ صریحاً انکار کر دیتی ہے، اور جب سیدا اسے طعنہ دیتا ہے کہ کیا کسی اور کو منتخب کر لیا ہے تو وہ جوتے سے اس کی پٹائی کرتی ہے اور اس کے منہ پر تھوک دیتی ہے۔[۷] عورت کی پیش قدمی کی تنکیر اس کے اندر خواہش اور مروجہ رشتے کو قبولنے کی تنکیر کی صورت میں متشکل ہوتی ہے۔۔۔ بھول جا کہ میں کبھی تیرے حق میں تھی۔ عزت

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلہ
دریافت

تیری اسی میں ہے کہ کاغذ دے دے مجھے کل تک نہیں دے گا تو میں بھی کسی آتے جاتے کے نیچے لیٹ جاؤں گی۔۔۔(۸) اتنا کھلا چیلنج سیدے کے اعصاب سہار نہ سکے اور اپنی توہین کا بدلہ چکانے کے لیے وہ سنگری کو اٹھا کر لے گیا اور اس کے دماغ کا کیڑا نکالنے کے لیے خوب پٹائی کی۔ سنگری نے جس طرح جوتے اور تھوک سے سیدے کی توہین کی اس کے بعد اسے متوقع ردعمل کے لیے تیار رہنا چاہیے اور اسے برداشت کرنے کا حوصلہ بھی رکھنا چاہیے تھا۔ اس مرحلے پر اصولاً تو دونوں کا کیتھارسس ہو جانا چاہیے تھا دونوں نے ایک دوسرے کی ہتک کی اور دونوں نے اس کا بدلہ لیا اور ایک دوسرے کو اذیت پہنچائی، مگر مصنف اسے کافی نہیں سمجھتے، وہ سنگری کے کردار میں مزید رنگ بھرنے کے لیے ابھی صورت حال میں مزید بگاڑ چاہتے ہیں۔ نکاح میں آئی ہوئی جوان عورت کے قرب اور کشش میں مبتلا سیدا گومگو کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے اور اس کے دل میں اپنے کیے پر ندامت اور ملال پیدا ہوتا ہے۔۔ کوئی بھلا اپنے نکاح میں آئی ہوئی عورت سے بھی ایسا سلوک کرتا ہے۔۔ سارا قصور اسی حرامزادی کا تو ہے۔۔ تھوکتی تھی نہ مجھ پر۔۔ یہ مجھے جوتے مارے اور میں بٹھاؤں اسے سر آنکھوں پر۔۔ جان لے کہ حق والیوں کا اگر دماغ خراب ہو جائے تو انھیں رنڈی کیسے بنایا جاتا ہے۔(۹) ممکن تھا کہ یہ متشددانہ ملاقات کسی فطری انجام کی طرف بڑھ جاتی اور دونوں کرداروں کے جذباتی وفور میں کوئی ٹھہراو کا مقام آجاتا، مگر سنگری کا جارحانہ رویہ سیدے کے اشتعال کو انگیز کرتے ہوئے ایسی نہج پر لے آتا ہے کہ وہ بہ جبر جسمانی حق وصول کرنے پر تل جاتا ہے۔۔ بہت کتی چیز ہے تو۔۔۔ تقدیر لکھنے والے نے تو تجھے میرے ہاتھ سے بچ جانے کا موقع دیا تھا مگر جو عورت اپنی تقدیر خود لکھنا چاہتی ہو اسے پھر تقدیر لکھنے والا بھی نہیں بچاتا۔۔ تو میرے نکاح میں تھی۔۔ تو نے میرے منہ پر تھوکا اور میں نے تیری کوکھ میں، حساب برابر۔۔۔ جا میں نے تجھے آزاد کیا۔(۱۰) ہیجانی ملاپ کا یہ لمحہ ایک بھیانک صورت میں منتج ہوا۔ سنگری جسمانی جولانیوں کو کھوجنا چاہتی تھی اور مرد کے قرب کی متمنی تھی اور سیدا بھی اس کے وصل سے باریاب ہونا چاہتا تھا۔ حاکم وقت سے ٹکر لینے کے باعث سنگری سے دوری اور بے مراد مر جانے کا خوف اس کے اعصاب پر طاری تھا۔ اب جبکہ دونوں کی خواہش کی تکمیل کا ساماں ہو گیا تھا تو پھر یہ بھیانک نتیجہ ناقابل فہم اور بلاجواز ہے۔ بقول فیصل اقبال اعوان مصنف نے بلاوجہ کی سنسنی پیدا کرنے کی کوشش میں کرداروں سے ان کی نفسیاتی گہرائی چھین لی ہے۔ ان کے اندرون، ان کے جذباتی ہیجان، محسوسات، نفسیاتی کشمکش اور انفرادی پندار کا بیان اتنا بچکانہ ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ ایک فنکار انھیں اتنی بے ہودگی سے کیسے بیان کر سکتا ہے۔۔ کردار۔۔ کسی سنجیدہ مطالعے کا موضوع نہیں بن پاتے اور نہ ہی اپنے دور کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے آئینہ دار بن پاتے ہیں۔(۱۱)

یہی وہ نازک مقام ہے جہاں کردار کا ارتقاع معکوس سمت مڑتا نظر آتا ہے۔ کردار نے جس جرات مندی، قوت ارادی اور وجودی حرمت کی پاسداری کے شعور کا مظاہرہ ابتدا میں کیا، آگے چل کر اسے نبھانے اور استحکام دینے سے قاصر رہتا ہے۔ وہ اس عظمت کی قیمت سے بے بہرہ ہے۔ مروجہ اقداری پیمانوں سے مزاحمت کرنے اور ہوا کے مخالف چلنے والے کرداروں پر بھاری ذمہ داری آن پڑتی ہے اور یہی تخلیق کار کا امتحان بھی ہے۔ اس صورت حال کو جذباتی اتار چڑھاؤ کے فطری عمل سے گزار کر محسوسات کے تخلیقی اور فن کارانہ اظہار کی صورت ایک عمدہ کیتھارسس کا روپ دیا جا سکتا تھا مگر مصنف اس میں ناکام رہتے ہیں، اب تو اس پر کسی پنجابی فلم کا گمان ہوتا ہے۔ مصنف کرداروں کے افعال کو نفسیاتی اساس فراہم کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ کسی بھی کردار کو محسوسات کے نازک مقامات

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

تحقیقی وتنقیدی مجلہ
دریافت

آہ وفغاں سے گزارنے کے لیے محض سماجی مشاہدات اور خارجی افعال کا بیان کافی نہیں اس کے لیے انسانی بطون کی غواصی اور پختہ تخلیقی شعور نہایت ضروری ہے ورنہ تخلیق کار کردار کے آگے بے بس ہو جاتا ہے۔۔۔ناول نگار اپنے کرداروں میں جو رنگ بھرتا ہے وہ اس کے مشاہدات کا رنگ ہوتا ہے اور اس کو پیش آنے والے تجربات کا رنگ ہوتا ہے جو اس قدر پختہ، گہرا اور شوخ ہوتا ہے کہ ہر کردار کا پیرہن نمایاں ہو جاتا ہے۔اور یہ سب ناول نگار کی تخیلی اور تخلیقی صلاحیتوں کی بدولت ممکن ہوتا ہے۔(۱۲)

اس ملاقات سے فارغ ہوتے ہی سیدے کو انگریز فوج آلیتی ہے اور وہ ڈرامائی طور پر مفرور ہو جاتا ہے۔سنگری حاملہ ہو چکی ہے مگر وہ جہاندیدہ ماں کی آنکھوں میں دھول جھونکتی ہے اور حمل ٹیسٹ کرنے کے سارے مروجہ حربے بھی اس کی نیگٹو رپورٹ دیتے ہیں۔وہ ماں کے شک کے سامنے مسلسل انکاری رہتی ہے اور یہ تسلیم نہیں کرتی کہ وہ اپنے شوہر کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔عورت کا یہ رویہ منطقی طور پر انتہائی کمزور اور بودا ہے۔بالآخر وہ سب کی مخالفت مول لے کر بستی کے مولوی جار اللہ سے نکاح کر لیتی ہے۔(۱۳)سنگری کو ایک بہادر اور اپنے فیصلے آپ کرنے والی عورت ظاہر کیا گیا ہے۔سیدے کے ساتھ جھگڑے کا فیصلہ بھی اس کا اپنا تھا اور اس کی انا کے تحفظ کی خاطر کیا گیا تھا پھر کیا وجہ کہ وہ اپنے فیصلے کا بوجھ اٹھانے سے قاصر رہتی ہے اور جھوٹ کا سہارا لیتی ہے۔سیدے جیسا اکھڑ مرد ہمیشہ سے اس کا آئیڈیل رہا جو طاقت سے عورت کو رام کرے۔

لڑکیاں پوچھ ہلانے والے کتوں کے پیچھے نہیں جاتیں وہ تو جاتی ہیں ان کے پیچھے جو گردن میں دانت گاڑیں اور سارے بدن سے روح نکال لیں۔۔۔۔۔۔مرد تو وہ کسی کام کا ہوتا ہے جو عورت کے ترلے نہ کرے، نیچے لگا کے رکھے مگر پیار سے۔۔چمڑی ادھیڑ دے مگر کسی اور کو انگلی نہ کھڑی کرنے دے۔۔وہ گالیاں بھی دے تو کانوں میں ماکھی ٹپکے، ظلم کرے تو اس پر پیار آئے۔۔وہ قدم بھرے تو بھوئیں کو کانپا ہو۔چاند نکلے تو وہ مشکی سانپ کی طرح کالا لگے اور رات کالی ہو تو چاند بن جائے۔(۱۴)

پھر جب ایسا ہی مرد جسمانی طاقت کے بھرپور مظاہرے کے بعد اس کی کوکھ ہری کر جاتا ہے تو ڈر کس بات کا۔اسے تو اس پر فخر کرنا چاہیے، فخر نہ بھی ہو تو کم از کم اتنی اخلاقی جرات ہونی چاہیے کہ اس کے ساتھ اپنے رشتے کی سچائی کو تسلیم کر سکے۔بہادری سے اتنا بڑا اقدام اٹھانے والی عورت بے بنیاد خوف سے زمیں بوس ہو گئی۔مروجہ معاشرتی معیارات کے مطابق کسی بن بیاہی کا حاملہ ہونا ضرور ناقابل قبول تھا مگر اس کے پاس تو اپنے شوہر کا نام قانونی اور اخلاقی ڈھال کے طور پر موجود تھا۔اس نے جب اپنے اختیار اور طاقت کو آزما کر یہ گھڑی مول لی تھی تو پھر اپنی اولاد کو جرات اور وقار کے ساتھ باپ کی شناخت دینی چاہیے تھی۔ایسے میں خوف زدہ ہونے اور تحفظ حمل کی خاطر ملا سے نکاح کرنے کا فیصلہ منطقی طور پر انتہائی سطحی اور کمزور ہے اور کسی بھی طرح سنگری جیسی عورت کے کردار سے لگا نہیں کھاتا۔بستی کے ایمان کا سودا کرنے والا، انگریز سرکار کا آلہ کار ساٹھ سالہ بڈھا گھاگ مولوی اتنا احمق کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک چھوکری کی چال کا آسانی سے شکار ہو جائے۔دوسری طرف ایسا شخص سنگری کا انتخاب کیسے ہو سکتا ہے جب کہ بہت سے کڑیل مرد اس کے عشق میں آہیں بھرتے ہوں اور شادی کے خواہش مند ہوں۔مصنف ایسا کر کے کردار کو جس دانش اور بصیرت کا حامل دکھانا چاہتے ہیں وہ بعید از قیاس اور خاصا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔سنگری کا کردار اس پست سطح پر آجاتا ہے کہ وہ ایک عام عورت کی نمائندگی سے بھی معذور نظر

آتی ہے۔ سب سے مضحکہ خیز اور فلمی بات یہ ہے کہ جس طرح اس کے پہلے نکاح کے فسخ ہونے اور دوسرے نکاح کے ممکن ہونے کو جواز دیا گیا ہے کوئی بھی ذی شعور انسان اسے تسلیم نہیں کر سکتا۔

مصنف نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس مضحکہ خیزی میں اضافہ کرتے چلے گئے ہیں۔ مولوی جار اللہ سے نکاح کرنے کے محض چند مہینے بعد بستی کے لوگ قبرستان والے معاملے پر مشتعل ہو گئے۔ اگرچہ یہ اشتعال اور رد عمل بہت غیر منطقی اور فلمی معلوم ہوتا ہے، بہر حال اس اشتعال کے نتیجے میں مولوی کی جان چلی جاتی ہے اور سنگری بیوہ ہو جاتی ہے۔ یہ ایک مناسب موقع تھا جہاں سنگری کو اس فلمی منظر نامے سے نکال کر ایک زندہ کردار میں منقلب کیا جا سکتا تھا مگر مصنف کی جانب سے عورت کے اس کردار کو نابود کرنے کا بہت مصمم ارادہ نظر آتا ہے۔ مشرقی معاشرت میں ایک روایتی بیوہ عورت وقار کی چادر اوڑھ کر اور محنت مزدوری کر کے بیوگی کاٹ لیتی ہے۔ جب کہ بہادر اور جی دار عورت عقد ثانی کے حق کو استعمال کرتی ہے اور اپنے بل پر اپنی زندگی خود مختاری سے بسر کرتی ہے۔ مصنف سنگری کو بھی ایک بہادر عورت بنانا چاہتے ہیں مگر کیا کیجیے کہ ہر اینٹ اس کی تعمیر کے بجائے مسماری کو مضبوط کرتی جاتی ہے۔ اس لیے ملاحظہ کیجیے کہ سنگری وضع حمل کے خوف سے نام نہاد "عزت" سے عہدہ بر آ ہو چکی تھی اور مجبوری (اگر تھی) سے اختیار کردہ شوہر سے نجات پا چکی تھی۔ اب امکانات سے بھرپور زندگی اس کے سامنے تھی، منگر جیسا چاہنے والا اپنانے کو تیار تھا، سیدے کا انتظار بھی کر سکتی تھی، ان دونوں کے علاوہ کسی بھی مناسب شخص کا انتخاب کر سکتی تھی۔ اپنے بل پر زندہ رہنے والی سنگری نے جینے کا ڈھب نکالا بھی تو کیا کہ مرحوم شوہر کے بڑے بیٹے سے راہ و رسم بڑھالی، محض اس لیے کہ وہ مہربان رہے اور نان نفقہ چلتا رہے۔ جب چھوٹا مولوی قابو سے باہر ہونے لگا تو سنگری نے چٹ پٹ مرحوم شوہر کے چھوٹے بھائی ملار کھے سے نکاح کر لیا اور وہ محض دو روز میں ہی شادی مرگ سے شہید ہو گیا۔ کردار کے ان افعال اور فیصلوں کی توجیہ اور صورت واقعہ کا بیان اس قدر بھونڈا، غیر منطقی اور عامیانہ ہے کہ سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے۔

ایک مضبوط اور بلند کردار عورت کی تعمیر کرتے کرتے مصنف اسے اس پست سطح پر لے آتے ہیں کہ وہ محرماتی رشتوں کی حدود تک فراموش کر دیتی ہے اور کسی قحبہ کی طرح جسم کی قیمت پر جینا چاہتی ہے۔ اپنے وجود کا عرفان رکھنے والی عورت تو ایک طرف، کوئی معمولی عورت بھی مرد کو رام کرنے کے لیے اپنی تذلیل گوارا نہیں کر سکتی۔ سنگری کا مسخ اور پچکا ہوا کردار مصنف کے کردار نگاری کے شعور سے عدم واقفیت کا غماز ہے۔ ممکن ہے مصنف نے اپنے گرد و پیش یا تاریخی اوراق میں سے کسی اکھڑ اور خود آشنا عورت کا روپ ملاحظہ کیا ہو اور اسے سنگری کے کردار میں مجسم کرنا چاہتے ہوں، مگر شاید وہ یہ نہیں جانتے کہ حقیقی زندگی کے یہ کردار تخلیقی قالب میں ڈھلنے کے لیے ایک موت کے متقاضی ہوتے ہیں۔ انھیں زندگی دینے کے لیے آزاد چھوڑ دینا اور اپنے تخلیقی بطن میں تحلیل کرنا بہت ضروری ہوتا ہے ورنہ وہ تخلیق کار کی جبریت سے ہمیشہ کے لیے مر جاتے ہیں۔۔۔ کردار نگار کو اپنے ذہن کی جدوجہد سے کرداروں کے جسم میں روح بن کر سمانا چاہیے اور انھیں اپنے آپ سے قریب لانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔[۱۵] مصنف نے سنگری کو امر کرنے کے جتن میں اسے ہلاک کر دیا ہے۔ لگتا ہے وہ اسے انواسی اور کنگالی ہوئی عورت ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ سنگری کے روپ میں اس دھرتی کی جس مقامی عورت کی تجسیم کی گئی ہے وہ یہاں کی عورت کے کسی بھی روپ سے مطابقت نہیں رکھتی۔ وہ نہ تو مفاہمت کرنے والی اور فیصلوں کے سامنے بلا چون وچرا سر جھکانے والی بے زبان عورت ہے اور نہ ہی فیصلوں کے خلاف ڈٹ جانے والی مزاحمت پسند اور

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

جرات اظہار رکھنے والی نڈر عورت بن پائی ہے۔ سنگری کی یہ مسخ تشکیلی ساخت دراصل ایک رد تشکیلی بیانیہ ہے جو مردانہ سماج کی مخصوص پست اور سطحی سوچ کا عکاس ہے۔ مصنف عورت کی اس قدر تذلیل کر کے انتہائی پست، لاچار اور مجبور و مقہور دکھا کر بزعم خود اس خطے کی عورت کی بے بسی اور مظلومیت کو اجاگر کر رہے ہیں۔ اصل میں یہی سوچ عورت کی بے بسی اور مقہوری کی ذمہ دار ہے۔ اپنے تئیں سماجی انصاف، عدل اور انسانی حقوق کے پرچارک ادیب عورت کے وجودی انکار اور کرداری غیاب کے ذمہ دار ہیں۔ اس نام نہاد مظلومیت کے پردے میں عورت کی جو بے توقیری اور dehumanization کی جاتی ہے وہ ایک تشویش ناک رویہ ہے۔ حقیقتاً ایسا رویہ عورت کی حمایت اور وکالت کرنے کے بجائے اس کی کردار کشی کا باعث بنتا ہے۔ دراصل یہ عورت کی مظلومیت کو آلہ کار بنا کر مقبول ہونے کا آسان حربہ ہے۔ معاصر ادبی منڈی میں یہ ایک مقبول ٹریڈ مارک ہے۔ معاصر ادبی منظر نامے میں ایسی کردار نگاری اور اس طرح کے سطحی متون ایک غالب رجحان کی حیثیت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ یہ عورت کے کردار کا ایک منفی اور مسخ شدہ روپ ہے اور عورت کی بنیادی جبلتوں کے خلاف ہے۔ عورت کو زندگی دینے کی معکوس چال دراصل اس کی موت کا اثبات ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ علی احمد فاطمی، ناول کی شعریات، دہلی، عرشیہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء، ص۱۹

۲۔ پروفیسر شوکت مغل، شوکت اللغات، سرائیکی ادبی بورڈ، ملتان

۳۔ محمد حفیظ خان، انواسی، جہلم، بک کارنر، ۲۰۱۹ء، ص۲۵

۴۔ ایضاً، ص۲۶

۵۔ ایضاً، ص۳۷

۶۔ ایضاً، ص۳۷

۷۔ ایضاً، ص۶۰-۱

۸۔ ایضاً، ص۲۰-۲۱

۹۔ ایضاً، ص۸۷-۸۹

۱۰۔ ایضاً، ص۹۳-۹۳

۱۱۔ فیصل اقبال اعوان، حفیظ خان کا ناول "انواسی" اردو ناول کی بدقسمتی کا تسلسل، تجزیات آن لائن، ۳۰-۶-۲۰۲۱ https://www.tajziat.com/article/11991

۱۲۔ شاعر علی شاعر، جدید اردو ناول: اسلوب و فن، لاہور، عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء، ص۴۳

۱۳۔ محمد حفیظ خان، انواسی، ص۱۶۲-۱۶۴

۱۴۔ ایضاً۔ ص۱۶۱-۲۴۱

۱۵۔ ڈاکٹر نجم الہدیٰ، کردار اور کردار نگاری، مدراس، ۱۹۸۰ء، ص۶۵

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 16. Issue 02, December 2024

۱۶- https://www.rekhta.org/ebooks/kirdar-aur-kirdar-nigari-dr-najmul-hoda-
ebooks?lang=ur

References in Roman Script:

1. Ali Ahmad Fatami, Novel ki Shairiyat, Dehli, Arshiya Publications, 2016, P. 19
2. Professor Shoukat Mughal, shoukat ul lughat, Saraiki Adab Board, Multan.
3. Muhammad Hafeez Kha, Anwasi, Jhelum, Book Corner, 2019, P. 25
4. Ibid, P. 26
5. Ibid, P. 26
6. Ibid, P. 37
7. Ibid, P. 20-21
8. Ibid, P. 20-21
9. Ibid, P. 87-89
10. Ibid, P. 92-93
11. Faisal Iqbal Awan, Hafeez Khan Ka Novel “Anwasi” Urdu Novel ki badqismati ka tasalsal, Tajziyat Online, 03-02-2021. https://www.tajziat.com/article/11991
12. Shayer Ali Shayer, Jadeed Urdu Novel: Usloob o Fun, Lahore, Aks Publications, 2019, P. 43
13. Muhammad Hafeez Kha, Anwasi, Jhelum, P. 162,164
14. Ibid, P. 161, 241
15. Doctor Najam ul Huda, Kirdar aor Kirdar Nigari, Madrass, 1980, P. 65
16. https://www.rekhta.org/ebooks/kirdar-aur-kirdar-nigari-dr-najmul-hoda-ebooks?lang=ur

Dr. Abida Naseem is a Lecturer in the Department of Urdu at University of Sargodha, Pakistan. She completed her Ph.D. in Urdu from the University of Sargodha, Pakistan specializing in Fiction. She has authored nine articles and one book. Her research interests include narrative techniques and themes in Urdu fiction.

انڈیکس

مقالہ نگار	عنوان	صفحات نمبر	ملخص	کلیدی الفاظ
ڈاکٹر طارق محمود / ڈاکٹر علی بیات	مکاتیبِ علامہ محمد اقبال بنام غلام عباس آرام: متن، حواشی اور اہم مباحث کا جائزہ	۱۔۲۲	یہ مقالہ علامہ اقبال کے غلام عباس آرام کو لکھے گئے خطوط اقبال کے ایران سے فکری تعلق کو سمجھنے میں اہم ہے۔ غلام عباس آرام، ۱۹۰۳ میں یزد میں پیدا ہوئے اور بمبئی میں خدمات انجام دے رہے تھے، ادب، تصوف، فلسفہ اور شاعری سے شغف رکھتے تھے۔ اقبال کے انگریزی زبان میں لکھے گئے یہ چار خطوط مختصر مدت کے دوران تحریر کیے گئے۔ آرام نے ان خطوط کو اپنی ذاتی دستاویزات میں محفوظ رکھا، تاہم اقبال کی فکر پر کوئی تحریر یا مقالہ نہیں لکھا۔ بعد میں ڈاکٹر حسین علی نزری نے ان خطوط کا فارسی میں ترجمہ کیا، جو ۱۹۹۷ میں "تاریخ معاصر ایران" میں شائع ہوئے۔ یہ خطوط اقبال کے ایران سے فکری روابط اور دلچسپی کو نمایاں کرتے ہیں۔	علامہ اقبال، خطوط، غلام عباس آرا، بمبئی، فارسی، تاریخ ایران
ڈاکٹر محسن رمضان اشسیور / زینب التن کوپریو	تاریخی ڈراموں کے تناظر میں برصغیر پاک وہند کی ثقافت پر ترک ڈرامے "کرولوش عثمان" کے اثرات کا مطالعہ	۲۳۔۳۱	ٹیلی ویژن اور دیگر ذرائع ابلاغ تاریخی علم کی تشہیر میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ بصری اور صوتی مواد تاریخی واقعات کو سمجھنے میں آسانی پیدا کرتا ہے، جبکہ تعلیمی پروگرامز، ڈاکیومینٹریز، فلم اور ڈرامہ باقی ذرائع کی نسبت زیادہ گہرائی سے تاریخی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ اس مقالے میں ترک سیریز "کرولوش عثمان" کے برصغیر کی ثقافت پر اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ سیریز سلطنت عثمانیہ کے قیام کے دور کو ڈرامائی انداز میں پیش کرکے ناظرین کو ایک تاریخی نقطہ نظر فراہم کرتی ہے۔ اس مقالے میں برصغیر میں اس سیریز کی مقبولیت، ناظرین کی دلچسپی اور سوشل میڈیا پر اس کے اثرات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔	ٹیلی ویژن، ذرائع ابلاغ، سلطنت عثمانیہ، ثقافتی تاریخ، فلم، ڈرامہ، ثقافتی اثرات
ڈاکٹر قندیل بدر	معاصر بلوچستانی اردو نظم کا اساطیری اور داستانوی رنگ	۳۲۔۵۰	اردو نظم میں اساطیری اور خیالی عناصر ابتدا سے موجود ہیں، جو ۱۹۶۰ کے بعد نکھر کر سامنے آئے۔ اکیسویں صدی کی نظموں نے اپنے منفرد اساطیری ماحول اور نئی اساطیری تخلیقات کی بدولت الگ پہچان بنائی۔ معاصر بلوچستانی شاعری میں قدیم اساطیر کی نئی تشریحات، پرانے کرداروں کو نئے انداز میں پیش کرنا اور نئی اساطیری تخلیق شامل ہیں۔ قبائلی شاعری کے اساطیری عناصر جدید دور کی پیچیدگیوں کے ساتھ معاصر اردو شاعری کو نئی شکل دیتے ہیں۔ اس مقالے میں اساطیر، آغاز وارتقا اور بلوچی شاعری میں اساطیر کی پیش کش کا جائزہ لیا گیا ہے۔	بلوچستان، اردو نظم، اساطیر، افسانوی طرز، قبائلی شاعری، علامات، معاصر، نئی تخلیقات

سعیدہ ارم / ڈاکٹر ناہید قمر	عاصم بٹ کے ناول "دائرہ" میں شناخت کا مسئلہ	۵۱-۶۳	اس مقالے میں جدید دور کے پیدا ہونے والے شناختی بحران کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔ جس میں جدید دور کے شناختی مسائل، ان سے پیدا ہونے والے انفرادی و اجتماعی بحرانوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے، اس مقالے میں عاصم بٹ کا ناول دائرہ شامل ہے۔ عاصم بٹ ۲۱ویں صدی کے بہترین ناول نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا ناول "دائرہ " جدید انسان کی شناخت کے بحران، تنہائی اور داخلی دنیا کی مشکلات کو نمایاں کرتا ہے۔ اس مقالے میں شناخت کے مسائل اور ان کے سماج اور فرد پر اثرات کو تنقیدی انداز میں بیان کیا گیا ہے، جس کے مطالعے سے ہم جدید دور کے شناختی مسائل او فرد کی نفسیات کو بہتر سمجھ سکتے ہیں۔	ناول، دائرہ، شناخت، تنہائی، ویرانی، مشکلات، بحران
ظہور احمد / ڈاکٹر رئیس احمد مغل	منتخب اردو فونٹس کا تکنیکی تقابل	۶۴-۷۸	اس مقالے میں منتخب اردو فونٹس کا تکنیکی موازنہ پیش کیا گیا ہے۔ اس مقالے کا مقصد ان کمپیوٹر فونٹس کی شناخت کرنا ہے جو نستعلیق رسم الخط کے روایتی خطاطی کے تکنیکی معیار پر پورا اترتے ہوں۔ اس مطالعے میں پانچ فونٹس کا تجزیہ کیا گیا: پاک نستعلیق، جمیل نوری نستعلیق، فیض لاہور، قلم تاج نستعلیق اور مہر نستعلیق ویب۔ ان فونٹس کو روایتی نستعلیق خطاطی کے منتخب تکنیکی معیار کے تحت پرکھا گیا ہے۔۔	نستعلیق، نستعلیق فونٹس، اردو فونٹس، خطاطی
عطرت بتول / ڈاکٹر اقلیمہ ناز	لارنس وینوتی کے نظریات ترجمہ کے تحت منٹو کے افسانہ "ممی" کے انگریزی تراجم کا مطالعہ	۷۹-۹۷	منٹو اردو افسانہ نگاری کا ایک ممتاز نام ہیں، جن کی مختصر کہانیاں نہ صرف اردو قارئین میں مقبول ہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی شہرت رکھتی ہیں۔ اس عالمی مقبولیت کی ایک وجہ ان کہانیوں کا انگریزی میں ترجمہ ہے۔ تاہم، یہ بات اہم ہے کہ ترجمہ ہمیشہ اصل متن کی طرح نہیں ہوتا کیونکہ ترجمے کے دوران اصل تحریر کی بعض خوبیاں منتقل نہیں ہو پاتیں۔ ثقافتی اختلافات اور زبانوں کی مختلف نوعیت بعض اوقات ترجمے کے لیے مشکلات پیدا کرتی ہے۔ اس مقالے میں منٹو کی کہانی "ممی" کے دو انگریزی ترجموں کا تجزیہ کیا گیا ہے اور اس میں لارنس وینوتی کی "ڈومیسٹیکیشن اور فورنائزیشن" کا اطلاق کیا گیا ہے۔ یہ مقالہ منٹو کی افسانوی تخلیقات کے ترجمے پر موجودہ تحقیق کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش ہے۔ تقابلی تحقیق کے طریقہ کار کو استعمال کرتے ہوئے متن اور ترجمے کے درمیان فرق کا تجزیہ کیا گیا ہے۔	منٹو، ماخذ متن، ہدفی متن، لارنس وینوتی، ڈومیسٹیکیشن، فورنائزیشن

ڈاکٹر محمد سہیل اقبال / ڈاکٹر محمد راشد اقبال	جدید اُردو فکشن: خواندگی کی سیاست اور سوال کی موت	۹۸-۱۰۸	یہ مقالہ ڈاکٹر حمیرا اشفاق کی کہانی "ابن سقراط" اور شاہد صدیقی کے ناول "آدھے ادھورے خواب" کا تنقیدی اور متنی تجزیہ ہے۔ ان دونوں تخلیقات میں تیسری دنیا کے ممالک میں تعلیم کے برباد ہونے اور سیاسی حکام کی دانستہ بے اعتنائی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس مقالے میں یہ بات اجاگر کی گئی ہے کہ اساتذہ وہ ہستیاں ہیں جو قوموں کو بیداری، وژن اور بہتر زندگی گزارنا سکھاتے ہیں۔ تعلیم اور اساتذہ کی بدولت کسی بھی قوم کے افراد باشعور ہوتے ہیں، معاشرے بہتر ہوتے ہیں اور اقوام ترقی کرتی ہیں۔ تاہم، روشنی کی مخالفت کرنے والی قوتیں اب بھی تعلیم اور اساتذہ کے خلاف مزاحمت کرتی ہیں کیونکہ تعلیم ہی وہ آلہ ہے جو لوگوں کو اندھی روایات کی قید سے آزاد کرتا ہے۔ یہ مقالہ معاشرے میں استاد کے کردار کی اہمیت کے ساتھ ساتھ ترقی پذیر ممالک میں تعلیم کی ناکامی کے اسباب کا بھی جائزہ فراہم کرتا ہے۔ مزید یہ کہ یہ مقالہ معیاری اور غیر معیاری تعلیمی نظام کے مسائل اور اس کے اثرات کا تجزیہ کرتا ہے۔	حمیرا اشفاق، شاہد صدیقی، استاد، طالب علم، تعلیم، بیداری، سوالات، معاشرہ، تبدیلی، سقراط، قوم، روشنی۔
ڈاکٹر عابدہ نسیم	"انواسی": اثبات مرگ کا اظہاریہ	۱۰۹-۱۱۶	عورت کو موضوع بنا کر لکھے جانے والے ناولوں میں مختلف سماجی رویوں کو پیش کیا جاتا ہے جو عورت کے کردار اور معاشرتی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ "انواسی" ایک ایسا ناول ہے جو ۱۹ویں صدی میں پنجاب کی ایک عورت کے کردار کو اجاگر کرتا ہے۔ اس ناول میں مصنف نے سنگری کے کردار کو ایک ایسی عورت کے کردار کے طور پر پیش کیا ہے جو پدر سری سماج میں اپنی بقا کی جنگ لڑتی ہے۔ جبکہ اس مقالے میں مقالہ نگار نے سنگری کے کردار کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ سنگری کا کردار بعض وجوہات کی بنا پر کمزور ہے جو وقت کے ساتھ سمجھوتے کرتا ہے۔ اس مقالے میں موجودہ دور کے وہ مسائل جن کا خواتین کو سامنا ہے ان پر بحث کی گئی ہے۔	انواسی، خصوصیت مطالعہ، عورت کے کردار کا بدنامی

CONTENTS

Editorial		
Letters of Allama Muhammad Iqbal to Ghulam Abbas Aram: Review of Text, Footnotes and Key Discussions	Dr. Tariq Mahmood/ Dr. Ali Bayat	1
An Academic Study on Impact of the Turkish Drama "Kurulus Osman" on the Culture of the Indian Subcontinent in the Context of Historical Dramas	Dr. Muhsin Ramazan İşsever/ Zeynep Altinköprü	23
Mythological and Fictional Color of Contemporary Urdu Poem of Baluchistan	Dr. Qandeel Badar	32
The Problem of Identity in Asim Butt's Novel "Daira"	Saeeda Irum/ Dr. Naheed Qamar	51
Technical Comparison of Selected Urdu Fonts	Zahoor Ahmed/ Dr. Raees Ahmed Mughal	64
A Study of English Translations of Manto’s Short Story "Mummy"under Lawrence Venuti’s Theories of Translation	Itrat Batool/ Dr. Aqlima Naz	79
Modern Urdu Fiction: Politics of Literacy and the Asphyxiation of Critical Thinking	Dr. Muhammad Sohail Iqbal/ Dr. Muhammad Rashid Iqbal	98
"Anwasi": An Affirmation of Death	Dr. Abida Naseem	109
Index		117

DARYAFT

Department of Urdu Language and Literature, Faculty of Languages,
National University of Modern Languages, Islamabad, Pakistan
Email: daryaft@numl.edu.pk

SUBSCRIPTION/ORDER FORM

- Please accept my subscription for…………………. year(s).
- Orders are accepted preferably for calendar year i.e., January to December and are non-refundable.

I enclose my Online payment receipt/Pay Order/Bank Draft No………………………. payable to Editor Daryaft, **National University of Modern Languages (Daryaft Subscription)** Islamabad, Pakistan.

- For Online Payments: Askari Bank Account # for Daryaft: 0550380006660, IBAN: PK72ASCM0000550380006660

Account Title: **National University of Modern Languages (Daryaft)**
Make an online payment and share the receipt on this email daryaft@numl.edu.pk

OR

- Make payments through Pay orders/ Bank Draft in the name of Editor, Daryaft and upload the receipt and send the drafts on this Postal Address:

Editor Daryaft, Department of Urdu Language and Literature, Faculty of Languages, National University of Modern Languages, Islamabad

Local orders are to be made by Online payment (Or) Pay Orders and Foreign orders by Bank Drafts

ANNUAL **SUBSCRIPTION RATES** - Please select:

	Inland	Foreign
Individual Subscription	Rs. 2000/- (Including Postal Charges)	US$ 20/- (Excluding Postal Charges)
Institution Subscription	Rs. 3000/- (Including Postal Charges)	US$ 30/- (Excluding Postal Charges)

Address to which the journal is to be sent

Name ……………………………………………………………………………….

Address …………………………………………………………………………….

………………………………………………………………………………………

Institution …………………………………………………………………………..

Contact Number ……………………………………………………………………

Email ……………………………………………………………………………….

DARYAFT

Vol:16, Issue:02

July - December 2024

ISSN Online: 2616-6038
ISSN Print: 1814-2885

“DARYAFT” is a HEC Recognized Journal

It is included in Following National & International Databases:

1. DOAJ (Directory of Open Access Journals)
2. Crossref
3. MLA database (Directory of Periodicals & MLA Bibliography)
4. Index Urdu Journal (IIUI),
5. International Scientific Indexing (ISI)
6. Scientific Indexing Services (SIS)
7. Tehqeeqat, A Research Indexing System
8. EuroPub (Directory of Academic and Scientific Journals)

Department of Urdu Language and Literature,
National University of Modern Langauges, Islamabad

ADVISORY BOARD (INTERNATIONAL)

Prof. Dr. Heinz Werner Wessler
Department of Linguistics and Philology, Uppsala University, Uppsala, Sweden

Prof. Dr. Shahabuddin
Department of Urdu, Aligarh Muslim University, Aligarh, India

Prof. Dr. Moinuddin A. Jinabade
Centre for Indian Languages, School of Language Literature and Cultural Studies, Jawaharlal Nehru University, New Delhi, India

Prof. Dr. Muhammad Mahfooz Ahmad
Head, Department of Urdu, Faculty of Humanities & Languages, Jamia Millia Islamia, New Delhi, India

Dr. Arzu Ciftsuren
Department of Urdu, University of Istanbul, Istanbul, Turkiye

ADVISORY BOARD (NATIONAL)

Prof. Dr. Khalid Mehmood Khattak
Chairperson, Department of Urdu, University of Balochistan, Quetta, Pakistan

Prof. Dr. Zia Ul Hassan
Institute of Urdu Language and Literature, Oriental College, University of Punjab, Lahore, Pakistan

Prof. Dr. Robina Shaheen
Head, Department of Urdu, University of Peshawar, Peshawar, Pakistan

Prof. Dr. Saima Irum
Chairperson, Department of Urdu, Government College University, Lahore, Pakistan

Prof. Dr. Sohail Abbas
Chairperson, Department of Urdu, Ghazi University, Dear Ghazi Khan, Pakistan

EDITORIAL BOARD (INTERNATIONAL)

Prof. Dr. Halil Toker
Head of Urdu Language and Literature Chair, Istanbul University, Istanbul, Turkiye

Prof. Dr. Khawaja Ekram ud Din
Department of Urdu, Jawaharlal Nehru University, New Delhi, India

Prof. Dr. Asuman Belen Ozcan
Head, Department of Urdu, University of Ankara, Ankara, Turkiye

Prof. Dr. Mehmoodul Islam
Department of Urdu, Faculty of Arts, Dhaka University, Dhaka, Bangladesh

Prof. Dr. Ibrahim Muhammad Ibrahim
Head, Department of Urdu, Faculty of Humanities, Al-Azhar University (Girls Campus) Madeent Nasr, Cairo, Egypt

EDITORIAL BOARD (NATIONAL)

Prof. Dr. Abdul Aziz Sahir
Dean, Faculty of Social Sciences and Humanities, Allama Iqbal Open University, Islamabad, Pakistan

Prof. Dr. Muhammad Kamran
Director of the Institute of Urdu Language and Literature, Oriental College, University of the Punjab, Lahore, Pakistan

Prof. Dr. Tanzeem-ul-Firdous
Head, Department of Urdu, University of Karachi, Karachi, Pakistan

Prof. Dr. Rubina Tareen
Department of Urdu, B.Z University, Multan, Pakistan

FOR CONTACT
Department of Urdu Language & Literature,
National University of Modern Languages, H-9, Islamabad
Telephone: 051-9265100-10, Ext: 2262
E-mail: daryaft@numl.edu.pk
Website (OJS): *https://daryaft.numl.edu.pk/index.php/daryaft*

DARYAFT

Vol:16, Issue:02

July - December 2024

ISSN Online: 2616-6038
ISSN Print: 1814-2885

PATRON IN CHIEF
Maj. Gen. ® Shahid Mahmood Kayani HI (M) (Rector)

CHIEF EDITOR
Prof. Dr. Jamil Asghar Jami (Dean Faculy of Languages)

EDITOR
Dr. Zafar Ahmed

CO-EDITOR
Dr. Abu Bakar Saddique Rathore

RESEARCH ASSISTANT
Mr. Muhammad Irfan

NATIONAL UNIVERSITY OF MODERN LANGUAGES

ISLAMABAD